دُنیا ایک کہانی ہے

ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور

دُنیا ایک کہانی ہے

پُرسحر افسانے

بھارت پُستک بھنڈار کٹڑہ ہلوالیہ
بازار گھنٹہ گھر امرتسر

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ ہیں

اوم
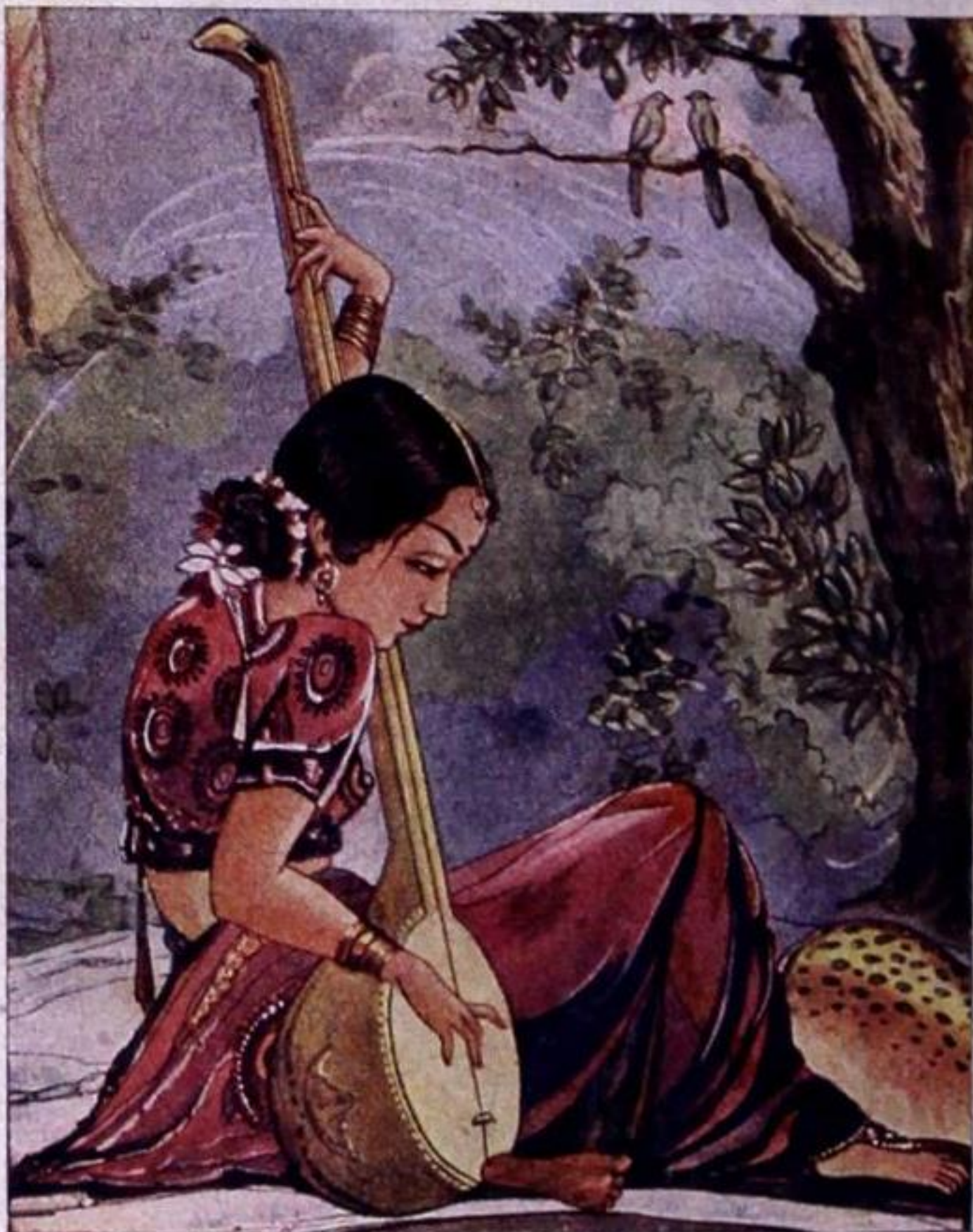
ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور کا عجیب و غریب شاہکار

دُنیا ایک کہانی ہے

و دیگر افسانے

از

شانتی نرائن پوری شاد کنجاہی امرتسر

پبلشرز

بھارت پستک بھنڈار بازار

گھنٹہ گھر کٹڑا آہلووالیہ امرتسر

(راما آرٹ پریس نزد ٹاؤن ہال امرتسر میں باہتمام رامناتھ پرنٹر چھپا)

نذر

اپنے بے چین جذبات افسانوں
کی شکل میں گیانی بلبیر سنگھ جی
پنجابی کی سیوا میں پیش کرتا ہوں

شاد

اوم

دنیا ایک کہانی ہے

ذرا اُس بلبلے کو دیکھ موجوں کے تھپیڑوں میں
خلاصہ کر کے گویا زندگی کی داستاں لکھ دی

ہم تینوں لڑکپن کے ہم راز دوست جس کمرے میں شب باش ہُوا کرتے تھے۔ اس کے ملحقہ کمرے کے ایک کونے میں انسان کی ہڈیوں کا مکمل پنجر رکھا ہُوا تھا۔ رات کو کھڑکی کے راستے آتے ہوئے تند ہوا کے جھونکوں سے ہڈیوں کی کھڑکھڑاہٹ ہمارے کمرے میں بخوبی سنائی دیتی تھی۔ ہم ان دونوں پنڈت جی سے موسم بہار کی شاعری اور کبس اسکول کے ایک طالب علم سے علم فزیالوجی پڑھتے تھے۔ ہمارے والدین کی آرزو تھی کہ ہم جلدی ہی ان علموں میں کامل ہو جائیں اُن کی یہ حسرت کہاں تک پوری ہو سکی۔ یہ بات اُن اصحاب کو. جو ہم سے آشنا ہیں بتانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ اور جو ہم سے معض

ناآشنا ہیں۔ وہ اصل حقیقت سے ناواقف ہی رہیں۔ تو بہتر ہوگا۔
آج اس بات کو کافی زمانہ گذر گیا ہے۔ بہت کوشش کرنے پر بھی اس بات کا پتہ لگانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ کہ اس مکان سے وہ ہڈیوں کا پنجر اور ہمارے فہم سے علم فزیالوجی کہاں چلا گیا

تھوڑے دن ہوئے۔ ایک دفعہ رات کو کسی وجہ سے جگہ نہ ملنے پر مجھے اسی کمرہ میں رات گذارنی پڑی۔ نئی جگہ ہونے کی وجہ سے اس کمرے میں نیند نہ آئی۔ نامعلوم نیند کی پریاں اس رات کہاں چلی گئیں تھیں۔ پہلو بدلتے بدلتے گرجانے سب بڑے بڑے گھنٹے۔ نو۔ دس۔ گیارہ۔ بارہ۔ بجا دیئے کمرے کے کونے میں جو چراغ روشن تھا۔ وہ بھی پانچ سات منٹ جھلملا کر گل ہوگیا۔ اس کے پہلے اس مکان میں دو ایک افسوس ناک اموات وقوع پذیر ہو چکی تھیں۔ اس وقت جبکہ روشنی ختم ہو گئی تھی۔ کمرے میں کامل خاموشی اور ظلمت نے تسلط جما لیا تھا۔ اُن اموات کا نقشہ میری آنکھوں کے سامنے سینما کی متحرک تصاویر کی طرح آنے لگا۔ میں نے خیال کیا کہ جیسے یہ شمعدان آدھی رات کے وقت گل ہوگیا ہے۔ اسی طرح کبھی رات کو اور کبھی دن کو زندگی کی شمع بھی گل ہو جاتی ہے۔

قدرت کے نزدیک دونوں صورتیں یکساں ہیں۔

یکایک اُس پنجر کا خیال فہم میں شعلہ زن ہُوا۔ اُس محروم زندگی کا زمانہ یاد کرتے ہوئے مجھے جلدی ہی معلوم ہُوا کہ کوئی زندہ چیز اندھیرے میں کمرے کی دیوار کو ٹٹولتی ہوئی مسہری کے گرد چکر کاٹ رہی ہے۔ اس کی چلتی ہوئی تیز سانس کی آواز بھی میرے کانوں میں پہنچی۔ مجھے ایسا معلوم ہُوا جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہی ہے۔ پھر خیال کیا کہ نہیں یہ تمام میرے بے آرام دماغ کی اختراع ہے۔

جس میں متواتر کئی گھنٹوں تک نیند کی ایک جھلک تک بھی نہیں آئی۔ مجھے یہ بھی خیال ہُوا کہ میرے دماغ میں جو دوران خوں اس وقت ہے۔ اُس کی حرکت کسی دوسرے کے چاروں طرف گھومنے کا وہم پیدا کر رہی ہے۔ میں ذی حوصلہ تھا۔ لیکن پھر بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس بے وجہ دہشت کو دور کرنے کے لئے میں نے یونہی ذرا ہلکی سی آواز میں کہا۔

کون ہے؟۔

"میں ہوں"

کسی نے جواب دیا۔

میرا وہ ہڈیوں کا پنجر کہاں گیا؟۔ اسی کو تلاش کرنے آئی

ہوں "!

کسی نے دوبارہ سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔

میں نے سوچا اپنے ان ہوائی خیالوں سے ڈرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ تکیے کو چھاتی کے نیچے رکھ کر بہت دیرینہ واقف کار کی طرح میں نے نہایت ہی شیریں آواز میں کہا۔ "اس آدھی رات کو خوب کام سوچا ہے۔ لیکن اب تمہیں اُس پنجر کی کیا ضرورت ہے؟"

اندھیرے میں مسہری کے پاس ہی جواب ملا۔ کیسا سوال کرتے ہو۔ میرے دل کی ہڈیاں اُسی میں تھیں۔ میری چھبیس سال کی جوانی اُسی کے چاروں طرف منڈلایا کرتی تھی۔ ایسی اچھی اور اپنی چیز کو دیکھنے کی حسرت ہونا کوئی حیرانی کی بات نہیں۔

میں نے کہا بات تو معقول ہے۔ اچھا تم جاکر اُس کا پتہ لگاؤ۔ اور مجھے سو لینے دو۔" وہ بولی" معلوم ہوتا ہے۔ تم اکیلے ہو۔ اچھا تو ذرا بیٹھ جاؤں۔ آؤ کچھ بات چیت کریں۔ پینتیس سال پہلے میں بھی انسان کے پاس بیٹھ کر انسانی جامے میں بات چیت کیا کرتی تھی۔ یہ پینتیس سال صرف قبرستان کی ہوا میں پرواز کرتے گذر گئے ہیں۔

آج پھر تمہارے پاس بیٹھ کر انسان کی طرح باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔

اس کے بعد مجھے ایسا احساس ہُوا۔ جیسے میرے پاؤں کے پاس مسہری کے اوپر کوئی بیٹھ گیا ہے۔ اور کوئی طریقہ نہ دیکھ کر میں نے کچھ زیادہ حوصلہ دکھا کر کہا۔ "اچھی بات ہے۔ کوئی دلچسپ واقعہ بیان کرو۔"

"دلچسپ" اُس نے حیرانگی کی آواز میں پوچھا۔ "تو کیا میری زندگی کے حالات سے زیادہ دلچسپ کوئی دوسرا افسانہ ہو سکتا ہے ـــــ کیا میں اُسے سناؤں؟"

گرجا کی گھڑی نے ٹن ٹن کر کے دو بجائے۔ میں نے زبان بند رکھنی ہی مناسب سمجھی۔ اُس نے میری خاموشی کو رضامندی سمجھتے ہوئے کہا۔

جب میں انسانی جامے میں تھی اور مشکل سے اپنی زندگی کی آٹھ یا نو منزلیں طے کر چکی تھی۔ اُس وقت میں ایک آدمی سے ملک الموت کی طرح خوف زدہ تھی۔ . . . وہ تھے میرے خاوند۔ کانٹے میں پھانسی ہوئی مچھلی کی جو حالت ہوتی ہے۔ ٹھیک ویسی حالت میری تھی۔ یعنی مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی ناواقف شخص مجھے کانٹے میں پھانس کر پانی سے لبریز تالاب یا میری محبت سے پُر جنم بھومی سے گھسیٹتا ہُوا خشک زمین پر لیجا رہا ہے۔ اور اِس کے

ہاتھ سے نجات پانی ازحد مشکل ہے .... شادی کے دو ماہ بعد میرے خاوند راہی ملک عدم ہوئے۔ اُن کی موت پر میرے نزدیکی رشتہ داروں نے بہت افسوس ظاہر کیا۔ میرے سسر نے بہت سی نشانیاں ملا کر دیکھا اور ساس سے کہا۔ "ہمارے شاستر جیسے زہریلی لڑکی کہتے ہیں۔ یہی تو ہے"۔ یہ الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونجتے ہیں۔ ــــــ سنتے ہو! کیسی اچھی داستان ہے۔

میں نے کہا:- "اچھی ہے کہانی کا آغاز نہایت ہی دلچسپ ہے۔"

وہ بولی: اچھا سنو! میں بڑی خوشی کے ساتھ باپ کے گھر چلی آئی۔ آہستہ آہستہ عمر بڑھنے لگی۔ میں نے باغ شباب میں قدم رکھا۔ چاہے لوگ میرے منہ پر میری خوبصورتی کی تعریف نہ کرتے تھے۔ مگر میں خود خوب جانتی تھی کہ میرے ایسی خوبصورت خاتون عموماً نظر نہیں آ سکتی۔ تمہارا خیال کیا ہے؟"

میں "ممکن ہے تم کسی زمانہ میں حد سے زیادہ حسین ہو۔ لیکن میں نے تو تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔"

وہ بولی۔ "دیکھا نہیں! کیوں؟ — میرا وہ پنجر۔ آہ آ۔۔۔ آ۔۔۔ کیا ٹھٹھا کرتی ہوں
اس کی خوفناک ہنسی سے کمرہ گونج اٹھا اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ ان نابینا گھڑوں میں پہلے وہ بڑی بڑی۔ کالی کالی۔ چمکدار مست نرگسی آنکھیں تھیں۔ اس وقت کے کھلے ہوئے بغیر مانس کے خوفناک دانتوں کے نزدیک ہنسی دیکھ کر تم کیا کوئی بھی قیاس نہیں کر سکتا کہ وہاں کسی وقت یاقوت کو مات کرنے والے عاشقوں کی اما جگہ ہونٹ تھے۔ اور ان کے اوپر دلکش مسکراہٹ رقص کیا کرتی تھی۔ اس پنجر کی ہڈیوں کے حصوں پر نہایت خولصورتی۔ عجیب وغریب دلکش اور باغ شباب کے مڈول جسم پر سختی — نرمی — پوری طرح شگفتہ کنول کی مانند لمحہ بہ لمحہ رقص رہی تھی۔ تمہارے سامنے یہ بیان کرتے ہوئے مجھے ہنسی بھی آتی ہے۔ اور غصہ بھی۔ اس وقت کے بڑے بڑے ڈاکٹر بھی مجھے دیکھ کر یہ خیال دماغ میں نہیں لا سکتے تھے۔ کہ میرے اس

جسم سے علم فزیالوجی بھی سیکھا جا سکتا ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ ایک ڈاکٹر نے مجھے اپنے ایک قریبی دوست کے سامنے "حسن کی دیوی" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ تمام لاشوں سے علم فزیالوجی اور جسم کے حالات سیکھے جا سکتے ہیں۔ مگر میں ہی خوبصورتی کا ایک ایسا کنول تھی۔ جو اس کام کے لئے موزوں نہیں۔ کون کہہ سکتا تھا: "حسن کی دیوی" بعید از قیاس ثابت ہوگی۔ جب میں زمین کو بھڑکتے ہوئے ــــ ناز بھرے قدموں سے ماپتی تو جیسے ہیرے کے متحرک ہونے سے چاروں طرف ضیا کی بھڑکتی ہوئی لہریں پھیل جاتی ہیں۔ ٹھیک اُسی طرح میرے اس مجسمہ حسن جسم کے ہر عضو سے خوبصورتی کی پرنور لہریں اِدھر اُدھر پھیل جاتی تھیں۔ میں اکثر اپنے ہاتھوں کو گھنٹوں دیوانہ وار آپ ہی دیکھا کرتی تھی۔ دونوں ہاتھ ایسے تھے کہ روئے زمین کی خوبصورتی کے منہ میں لگام ڈال کر اُسے اپنے قابو میں رکھ سکتے تھے۔ وہ سبھدرا جو تینوں عالموں کو حیرت میں غرق کرتی ہوئی اپنے فاتح کے ساتھ چلی گئی تھی۔ میرے

اپنے خیال میں اسے بھی ایسے لمبے سڈول بازو۔ لال ہتھیلی اور خوبصورتی کی چوٹی کی طرح انگلیاں عطا ہوئی تھیں۔ میرے اس زیورات سے خالی اور بغیر مالش کے پرانے اور بے شرم ہڈیوں کے پنجر نے تمہیں جو کچھ بتلایا ہے۔ بالکل باطل ہے۔ تمہیں یقین کرنا چاہئے کہ میری تمام باتیں سچائی پر مبنی ہیں —— گو تم اس پر شک تو ضرور کرو گے۔ کیونکہ تمہاری آنکھوں میں اصل صورت کی بجائے ہڈیوں کے پنجر کی صورت سما رہی ہے۔

کاش! میں سولہ سالہ —— جوانی اور جوش سے بھرے ہوئے خوبصورتی کے مجسمے کو تمہاری آنکھوں کے سامنے کھڑا کر سکتی تو ہمیشہ کے لئے تمہاری آنکھوں سے نیند حرام کر دیتی۔ اور تمہارے دماغ سے اس فضول بے ہودہ بدمزاج علم فزیالوجی کو بیزار کر کے نکال دیتی"۔

"بانو! یقین کرو۔ اگر تمہارا جسم ہوتا تو میں اُسے چھو کر تمہاری ہی قسم کھاتا کہ میرے فہم میں اس علم کا کوئی حصہ بھی باقی نہیں رہا۔ اور تمہاری وہ دلکش

عالم شباب کی خوبصورتی کی تصویر شب کے ظلمت کدہ پردے کو چیرتی ہوئی شعلہ آتش کی طرح میری آنکھوں کے سامنے چمک رہی ہے۔ اب تمہیں اور زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں"۔

اس نے کہا: "خیر جانے دو اور سنو۔ گھر میں میرا کوئی اور ساتھی نہیں تھا۔ باپ نے شادی نہ کرنے کی قسم اٹھا رکھی تھی۔ زنانے میں اکیلی ہی تھی۔ اپنے مکان کے چھوٹے سے چمن میں درخت کے نیچے اکیلی بیٹھ کر سوچا کرتی تھی۔ کہ تمام کائنات مجھے الفت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ تمام ستارے مجھے انس بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ بادصرصر کے نرم اور خوشگوار جھونکے جسم سے بغل گیر ہونے کیلئے بار بار پاس آتے ہیں۔ جس گھاس پر میں دونوں پاؤں رکھے بیٹھی ہوں۔ اگر اس میں حرکت ہوتی تو وہ بھی بت کی طرح ساکن رہ جاتی۔ میں اپنے دل میں قیاس کرتی تھی کہ عالم کے تمام نوجوان گروہ بنا کر گھاس کی شکل میں چپ چاپ میرے پاؤں میں کھڑے ہیں۔ اس وقت دل میں بے وجہ ہی خاص قسم کا درد

محسوس ہوتا تھا۔

پتا کے دوست ڈاکٹر رام ناتھ میڈیکل کالج سے پاس ہوکر آتے ہی ہمارے گھر کے ڈاکٹر بن گئے۔ میں نے پہلے دروازے کی آڑ میں انہیں کئی بار دیکھا تھا۔ پتاجی بہت ہی عجیب انسان تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ آنکھیں کھول کر عالم کو دیکھتے ہی نہیں۔ اُن کے احباب میں بس ایک رام ناتھ تھے۔ اس لئے شہر بھر کے تمام نوجوان کی جگہ صرف رام ناتھ ہی میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے تھے۔ جب سورج دیوتا دن بھر کی طول منزل ختم کر کے گوشۂ مغرب میں روپوش ہوتا۔ اور میں ملکہ بن کر بڑے درخت کے نیچے بیٹھتی۔ تب جہان کے تمام انسان رام ناتھ کی شکل اختیار کر کے میرے پاؤں میں سر خم کرتے تھے۔ سنتے ہو؟ کیا معلوم ہوتا ہے؟"

میں نے ایک لمبی سانس کھینچ کر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے۔ میں رام ناتھ ہوکر اُسی عالم میں پیدا ہوتا۔ تو اچھا تھا!"

اس نے کہا۔ "پہلے تمام داستان تو سن لو — ایک دن بادل تھا۔ مجھے ملیریا کی شکایت ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب دیکھنے

آئے اُن کے رو برو ہونے کا شاید یہ پہلا ہی موقع تھا۔

میں کھڑکی کی طرف منہ کئے لیٹی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شفق کی لالی میرے سفید بخار زدہ رُخساروں کے اوپر پڑے۔ تاکہ میرا حُسن کھویا ہُوا معلوم نہ ہو۔ ڈاکٹر نے اندر قدم رکھتے ہی جب ایک بار میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ تب میں نے دل ہی دل میں خود کو ڈاکٹر سمجھ کر تخیل کے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس شام کی روشنی میں نرم تکیئے کے اوپر کچھ مرجھائے ہوئے پھولوں کی مانند میرا خوبصورت اور دلکش چہرہ رکھا ہُوا تھا۔ کالی کالی عنبریں زلفیں ناگن کی طرح لہراتی ہوئیں چہرے پر آگئی تھیں۔ حیا سے جھکی ہوئی بڑی بڑی پر نور آنکھوں کی پلکوں کا سایہ رخساروں کے اوپر پھیلا ہُوا تھا!!

ڈاکٹر نے نرم اور میٹھی آواز میں ہما سے کہا۔

— میں نبض دیکھنا چاہتا ہوں"

میں نے کپڑے کے اندر سے۔ بیماری کی وجہ سے کمزور ہُوا ہاتھ باہر نکالا۔ ایک بار ہاتھ کی طرف دیکھا۔

اُس وقت خیال پیدا ہُوا - اگر نیلے رنگ کی کانچ کی چوڑی پہنی ہوتی تو کیا ہی اچھا ہوتا -

اس سے پہلے میں نے کبھی کسی ڈاکٹر یا وید کو اتنی دیر تک کسی مریض کی نبض دیکھتے نہیں دیکھا تھا - خاص محبت بھرے لہجہ میں کانپتی ہوئی انگلیاں سے انہوں نے میری نبض دیکھی - انہوں نے میرے ملیریا کا جوش بھانپ لیا - میں بھی تاڑ گئی کہ ان کے دل کے تار کہاں اٹک گئے ہیں - اور اُن میں سے کیسی آواز پیدا ہو رہی ہے —— کیا تمہیں اعتبار نہیں آتا؟ -

میں نے جواب دیا - مجھے تو یہاں بے اعتباری کی کوئی بات نظر نہیں آتی کیونکہ انسان کی رگیں ہمیشہ ایک جیسی نہیں چلتیں ''

وہ بولی:- ''اس کے بعد میں نے چند دنوں میں یہ محسوس کیا کہ میرے شام کے خیالی دربار میں سینکڑوں نوجوانوں کی تعداد گھٹتے گھٹتے صرف ایک تک آ کر رک رک گئی ہے - میرے تخیل میں زمین آدمیوں سے خالی ہو گئی - عالم میں صرف ایک ڈاکٹر اور ایک مریض بچ رہا -

آہستہ آہستہ میں صحت یاب ہوگئی۔ اب میں نے اپنے پروگرام میں خفیہ تبدیلی کی۔ میں تخیلے میں پتاجی سے خفیہ بسنتی رنگ کی ساڑھی پہنتی۔ گیسو سنوار کر ان میں گلاب لگاتی اور آئینہ لے کر بڑے درخت کے نیچے جا بیٹھتی۔

اس پہ آپ یہ سوال کر سکتے ہیں "کیا اپنے کو دیکھ دیکھ کر طبیعت سیر نہ ہوتی تھی؟" اس کا میں صرف یہی جواب دوں گی "نہیں ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ایک وقت میں دو شخصیتیں اختیار کرتی تھی۔ ایک میں خود اور دوسرا ڈاکٹر۔ اس وقت میں اپنی موہنی صورت ڈاکٹر کی الفت بھری نگاہوں سے دیکھتی تھی اس کے بعد مجھ پر کیف طاری ہو جاتا تھا۔ اور میں بے خود ہو کر جھومنے لگ جایا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود بھی دل میں شام کی ہوا کی طرح ایک لمبی سانس چکر لگایا کرتی تھی۔ اس وقت سے میں اکیلی نہیں رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کوئی سائے کی طرح میری نقل و حرکت کو دیکھ رہا ہے۔ میں جب چلتی تھی تب جھکی ہوئی آنکھوں سے دیکھتی تھی کہ میرے پاؤں کی انگلیاں زمین کے

اوپر کس انداز سے پڑتی ہیں ـــــ ساتھ ہی سوچتی تھی کہ میری یہ چال نئے پاس ہوکر آئے ہوئے ڈاکٹر کو کیسی معلوم ہوتی ہوگی۔ دوپہر کو سناٹا رہتا تھا۔ شاذو نادر کوئی چیل آسمان پر بہت دور بول اٹھتی تھی۔ چمن کی دیوار کے اس پار سٹرک پر لساطی۔ سرما۔ مسی۔ کنگھی۔ چونڈی کی صدا لگا جاتے تھے۔ میں ایک سفید چادر بچھا کر اس پر بیٹھتی تھی۔ پھر اپنے ہاتھ کہ بچھونے پر بے عزتی کے انداز سے رکھتے ہوئے سوچتی تھی کہ ضرور کسی نے دیکھا ہے۔ پھر خود بخود ایسا معلوم ہوتا کہ کسی نے دونوں ہاتھوں سے اُس کو اٹھا لیا۔ اور میری گلابی ہتھیلی کو بوسہ دے کر واپس جا رہا ہے"! اچھا اگر یہ قصّہ یہاں ہی تمام ہو جائے تو کیسا ہے!۔

مَیں نے اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے جواب دیا"۔ کچھ برُا تو نہ ہوگا۔ ہاں نامکمل رہ جائے گا۔ مگر اسے اپنے فہم میں سوچ کر مکمل کرنے میں باقی رات مزے سے گذر جائے گی۔

وہ بولی"۔ "لیکن ایسا کرنے سے کہانی بہت ہی بدمزہ ہو جائیگی۔ بھلا پھر اس کی دل کشی ایسی رہ سکتی ہے؟،

اور اس کے اندر لاسٹس کا بنجر اپنے سب دانت کھول کر کیسے دکھائی دے گا؟ ــــــ اچھا اس کے بعد سنو۔ جب ڈاکٹر کا کام کچھ تیز ہُوا تب اُس نے ہمارے گھر کے نچلے حصے میں اپنی ڈسپنسری کھول لی۔ آہستہ آہستہ میرا آنا جانا بھی ڈسپنسری میں ہو گیا۔ میں اِس دوران میں ہنسی مزاق میں دوائیوں کے بارے میں۔ زہر کے بارے میں اُس سے پوچھتی رہتی تھی۔ کئی بار یہ بھی دریافت کیا۔ کہ کیا کرنے سے انسان آسانی سے مر سکتا ہے؟۔ ان طبی باتوں میں ڈاکٹر کا دل خوب لگتا تھا۔ سنتے سنتے موت ایسا معلوم ہونے لگی جیسے ہمارے گھر کی ایک فرد ہے۔ اب مجھے محبت اور موت صرف دو چیزیں اس عالم میں ہر جگہ موجود نظر آنے لگیں۔

میری داستان قریباً ختم ہو چکی ہے۔ تھوڑی سی باقی ہے۔ بس"

میں نے کہا "رات بھی اب تھوڑی ہی باقی ہے

اُس نے پھر کہا۔ چند دن کے بعد مجھے معلوم ہُوا کہ ڈاکٹر کی شادی ہونے والی ہے براتِ اُسی شہر میں جائیگی۔ مگر یہ تمام باتیں مجھے شادی کے دن

ہی معلوم ہوئیں۔ اُسی دن صبح ڈاکٹر نے آکر کچھ سامان یعنی زیور۔ برتن وغیرہ پتا سے مانگے۔ پتا نے مجھ سے سب سامان نکلوا کر ڈاکٹر کو دیا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے پتا سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب یہ سامان کیا کرینگے؟"

"پتا نے کہا۔ آج اُن کی شادی ہے۔"

"کیا یہ سچ ہے"

کہہ کر میں مسکرانے لگی۔ پھر دل میں سوچا۔ مجھ سے یہ بات چھپا کر میری بے عزتی کرنے کا کیا مطلب ہے؟ کیا میں نے ان کو مجبور کر کے کہا تھا کہ اگر ایسا کرو گے تو میری جان کی خیر نہیں۔ مردوں پر یقین کرنا سراسر نادانی ہے۔ اس دنیا میں مجھے صرف ایک ہی مرد سے واسطہ پڑا ہے۔ اور چند منٹوں میں مجھے اس کے بارے میں واقفیت حاصل ہو گئی ہے۔

دوپہر کے بعد ڈاکٹر ایک بار پھر میرے مکان پر آیا۔ میں نے خواہش سے زیادہ ہنستے ہنستے کہا "کیا آج آپ کی شادی ہے؟"

وہ میری خوشی دیکھ کر صرف نادم ہی نہیں ہوُا بلکہ

بہت اُداس ہو گیا۔

میں نے سوال کیا "آتشبازی۔ گیسوں کی روشنی۔ اور بینڈ وغیرہ کا مکمل انتظام ہے۔ یا نہیں۔

یہ سن کر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کہا " کیا شادی اتنی بڑی خوشی کی بات ہے۔

میں تو یہ سن کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ ایسی بات تو میں نے کبھی سنی ہی نہ تھی۔

میں نے کہا یہ نہ ہو گا۔ آتشبازی۔ گیسوں کی روشنی اور بینڈ وغیرہ ضرور ہونا چاہیئے۔

میں یہ تمام شان وشوکت کے سامان مہیا کرنے کے لئے بتا کے پیچھے پڑ گئی ڈاکٹر کی برات میں براتی زیادہ نہ تھے۔ صرف دولہا۔ پنڈت۔ اور نائی تھا۔ اور انہیں بھی بہت دُور نہ جانا تھا۔ اسی لئے بڑی تیاری کی ضرورت نہ تھی۔ میری مجبوری پر گیس کی روشنی اور بینڈ کا انتظام ضرور کرنا پڑا۔

چھ بجے کے بعد ڈاکٹر صاحب ایک بیمار کو دوا دینے کیلئے ڈسپنسری میں آئے مریض کے چلے جانے بعد وہ بتا کے پاس ہی آ بیٹھے۔ پھر ایک ایک گلاس شراب کا

پیا۔ پتا جی کو اور ڈاکٹر صاحب کو شراب کی عادت پڑ گئی تھی۔

شام ہوئی آہستہ آہستہ چاند نکل آیا میں نے جا کر کہا "ڈاکٹر صاحب کیا بھول گئے۔ برات کب جائے گی؟"

یہاں پر یہ بات بھی کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کہ میں ڈسپنسری سے موقع پا کر تھوڑا سا زہر لے آئی تھی۔ وہی زہر آنکھ بچا کر تھوڑی سی ڈاکٹر والے شراب کے گلاس میں ڈال دی۔ زہر کہاں پڑی ہے یہ بات مجھے ڈاکٹر سے ہی معلوم ہوئی تھی۔

ڈاکٹر نے ایک لمحہ میں گلاس خالی کر دیا۔ پھر میری طرف کمزور نگاہیں ڈال کر بولا۔ "اچھا جاتا ہوں۔"

ڈاکٹر کے دروازے پر بینڈ بجنے لگا۔ میں نے بنارسی ساڑھی پہنی۔ صندوق میں جتنے زیور رکھے تھے۔ سب نکال کر پہن لئے۔

سر میں بہت سا سندور لگایا۔ پھر اسی گلشن میں درخت کے سائے میں سفید چادر بچھا کر لیٹ گئی۔

نہایت خوبصورت رات تھی۔ کائنات کے ذرے

ذرّے ذرّے پر چاندنی رقص کر رہی تھی - تمام دن کے تھکے ماندے ہوئے خواب ذرہ انسانوں کی تھکاوٹ دور کرنے والی میٹھی میٹھی عطر بیز ہوا چل رہی تھی - جو نہی کہ پھولوں کی خوشبو سے تمام گلشن مہک رہا تھا -

بینڈ کی آواز جب آہستہ آہستہ دور چلی گئی - چاند چھپنے کی تیاریاں کرنے لگا - اسی وقت درخت - مکان - آسمان - زمین - الغرض تمام کائنات کی چیزیں میرے چاروں طرف سے دور ہٹنے لگیں - تب میں آنکھیں بند کر کے ہنسی اور زہر کی پڑیا کھول کر حلق میں انڈیل لی -

خواہش تھی کہ جب لوگ آکر دیکھیں گے - تب یہی ہنسی میرے ہونٹوں پر رقص کرتی ہوئی نظر آئیگی - تمنا تھی کہ جب میں اپنے پیارے سے آخری بار رات کو ملنے جاؤنگی - تب اس ہنسی کو فانی دنیا سے اپنے ساتھ لے جاؤں گی:

مگر کہاں ہے وہ آخری رات ؟ -

کہاں ہے اپنے پیارے کا ملاپ ؟

اُور کہاں ہے میرا وہ شادی کا لباس؟"

اپنے اندر ایک قسم کی کھٹ کھٹ کی آواز سُن کر میں چونک پڑی۔ دیکھا تو معلوم ہُوا۔ میرا پنجر لیے تین طالب علم طب سیکھ رہے ہیں۔ دل جو کبھی آرام اور تکلیف سے گدگدا اٹھتا تھا۔ اور جہاں روانہ ایک ایک کر کے جوانی کے پھول کی پنکھڑیاں کھل رہی تھیں۔ وہاں چھڑی سے اشارہ کر کے ماسٹر صاحب لڑکوں کو بتا رہے ہیں۔ کہ اس ہڈی کا یہ نام ہے۔ اور اس کا یہ۔ وہ جو آخری ہنسی میرے ہونٹوں پر تھی۔ کیا اس کی کچھ لگاوٹ تم نے دیکھی ہے؟—

کہانی کیسی معلوم ہوتی ہے؟"

میں نے کہا "بڑی دلکش ہے"!

اُسی وقت ایک کوّا۔ کاؤ۔ کاؤ کرنے لگا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا ابھی یہاں موجود ہو؟"

"کچھ جواب نہیں ملا"!

میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا کمرے میں صبح کی سفیدی دروازے کے سوراخوں سے اندر داخل ہو رہی تھی۔

اور باہر گلی میں ایک سادھو پھیری لگا رہا تھا - اور گا رہا تھا -

یہ دُنیا ایک کہانی ہے
ہر چیز جہاں کی فانی ہے

کیا مان ہے بابا دولت پر
اس عزت پر اس شہرت پر

کبھی آتی ہے کبھی جاتی ہے
یہ دنیا رام کہانی ہے

زلزلہ

(۱)

شب تاریک تھی - دن کے تمام کام ختم ہو چکے تھے - سب نے خیال کیا کہ شب کا آخری مہمان بھی آچکا ہے۔ گاؤں کے تمام پھاٹک مقفل ہو چکے تھے - لیکن بعض کا خیال تھا۔ کہ ابھی بادشاہ نہیں آیا - ہم ہنستے اور کہہ دیتے -" نہیں یہ ناممکن ہے۔

ایسا معلوم ہوُا جیسے کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ ہم نے کہا کچھ بھی نہیں - شمعیں گل کر دی گئیں - اور ہم دراز ہو گئے۔ بعض نے کہا کوئی قاصد ہے۔ ہم کھِل کھِلا کر ہنس پڑے اور کہا -

" محض ہوا کا ایک تند جھونکا ہے -

(۲)

نصف شب کو آواز سنائی دی - ہم نے خیال کیا - بہت دور کسی قسم کے گرج ہے - زمین کانپی - دیواریں لرز اُٹھیں -

نیندیں اُچاٹ ہوگئیں۔ کئی بولے۔ یہ رتھ کے پہیوں کی آواز ہے!!
مگر ہم نے نیم خوابی کی حالت میں جواب دیا" بادلوں کی
گڑگڑاہٹ ہوگی"

شب بدستور ہیبت ناک اور سیاہ تھی۔ اتنے میں سنکھ
بجا اور آواز سنائی دی۔" ہوشیار ہو جاؤ۔ تاخیر کرنے
کا وقت نہیں"۔ ہم نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا۔ اور کانپ
اُٹھے۔ بہت سی آوازیں آئیں۔

وہ بادشاہ کا بڑا رتھ ہے۔

ہم اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے" اب دیر کا موقع بالکل
نہیں رہا"

(۳)

بادشاہ آگیا ہے۔ مگر روشنی کدھر ہے؟ ہار کس جگہ ہے؟
اور رنگ کہاں ہے؟" ان فضول باتوں کو چھوڑ دو!۔ خالی ہاتھ اُس
کو خوش آمدید کہو۔ اور انہیں بے سروسامان کمروں میں اتارو
دروازے کھول دو۔ سنکھ بجاؤ۔ اپنی بوسیدہ چٹائی لاؤ۔ اور
صحن میں بچھا دو۔ کیا یہ سب سامان ناکافی ہے؟ طوفان کے
ساتھ ہماری مہیب شب کا بادشاہ بھی ناگہاں آگیا ہے"۔

"گیتا نجلی"

کایا پلٹ

(۱)

گوپا حسین تھی مگر کمسن تھی
شیام راہگیروں کو لوٹ گھسیٹ کر گزارہ کرتا تھا۔ مگر گوپا نے نامعلوم کس وقت اس کا دل چرا لیا۔ اُسے خبر تک نہ ہوئی۔
وہ اُسے دل و جان سے چاہتا تھا۔ مگر ٹھنڈی سانس کھینچ کر رہ جاتا تھا۔ آہ!!! کیا وہ مجھ ایسے رہزن اور اُچکے کی محبوبہ بننا گوارہ کرے گی؟

(۲)

گوپا نان شبینہ تک سے محتاج تھی۔ دل سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی ـــــــ راجکمار کی شیدا ہو گئی!

راجکمار نے محبت کا جواب محبت سے دیا۔ مگر والدین
کا خوف حصول کامیابی میں روڑا اٹکا رہا تھا؟

اُدھر شیام کی برداشت کا پیمانہ بھی لبریز ہوگیا۔ وہ
حسن کی درگاہ میں نیاز مند ہوا۔ اور اپنا تمنائے وصال اس
کے سامنے رکھ دیا۔ مگر نیاز مند با نیاز نہ ہوا۔
——— منت سماجت کارآمد ثابت نہ ہوئی!
سفلی محبت فوراً آتش زیر پا ہوگئی!

(۳)

اب بھی وقت ہے۔ اپنا فیصلہ تبدیل کرلو ——"
مگر گوپا خاموش تھی۔ اُس کی زبان میں نہ حرکت آنی تھی۔
نہ آئی!

مگر بیچارے آنسوؤں کو رحم آگیا۔ وہ چھلک پڑے
اور ایسا کام کر گئے۔ جو بعض اوقات مسکراہٹ بھی نہیں
کرسکتی۔ شیام کی زبان تبدیل ہو گئی ——!

وہی شیام جو غصہ سے لال پیلا ہو رہا تھا۔ گوپا کے قدموں
پر گر پڑا!

(۴)

گوپا نے اپنے خواب راجکمار کے لیئے اور صرف راجکمار

کے لئے ہی وقف کر دیئے - مگر راجکمار محبت کی کسوٹی پر پورا نہ اُتر سکا ـــــــ محبت کے لئے نئی سرزمین میں داخل ہو گیا۔

گوپا حل مسوس کر رہ گئی۔

ایک دن گوپا اپنے کمرے میں مُردہ پائی گئی - ڈاکٹر نے موت کا سبب ہارٹ کا فیل ہونا بتایا - مگر اصل حقیقت سے بہت کم لوگ واقف ہوئے -

(۵)

وہی دولت جس کے لئے دن رات ایک کر دیا تھا - شیام کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی - چنانچہ ایک دن اس نے تمام دولت غریبوں میں تقسیم کر دی - اُس جگہ جہاں گوپا کی لاش جلائی گئی تھی - سنگ مرمر کا چبوترا بنوایا، اور خود بھی وہاں دھونی رما کر بیٹھ گیا۔

وہ اب تک زندہ ہے -

رات کے وقت جب دُنیا والے عالم خواب میں ہوتے ہیں - تو شمشان بھومی سے یہ آواز آیا کرتی۔

ہے

عشق کہتا ہے کہ عالم سے جُدا ہو جاؤ
حسُن کہتا ہے جدھر دیکھو نیا عالم ہے

لوگوں کا خیال ہے۔ یہ آواز کسی دوسرے کی نہیں
بلکہ سشیامؔ کی ہوتی ہے"۔

طائرِ خیال

(۱)

بے سہاروں کے سہارے! بے چین دلوں کی تسکین تو کہاں ہے؟

برسوں تیری تلاش میں موسم گرما کی کڑکڑاتی ہوئی دہوپ میں جاڑے کے پر شور ابر آلود بادلوں کی ہیبتناک گرج میں جب کہ نیلگوں سائیاں سیاہ دکھائی دیتا ہے - اور بارش نہایت خوفناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ موسلا دھار برسی ہے - سرگرداں رہا ہوں - ہینوں تیری جستجو میں دیر و حرم میں بھٹکتا پھرا ہوں - کئی دفعہ عیش و نشاط کی محفلوں - ساقی کے جام. باغ کے معطر پھولوں کی مہک - ہری - ہری - ڈالیوں - سرسبز پتوں - خوشنما کیاریوں - اور

صبح کی سنہری کرنوں میں تلاش کیا ہے ــ
" مگر تو نہیں ملا "
اکثر اوقات عالم ہو کی تاریک شب میں جب تمام کائنات پر خواب کا سایہ ہوتا ہے۔ ندی کے پُر سکوں آب میں۔ سمندر کی خوفناک طاطم خیز لہروں میں۔ تلاش کرتا ہوں۔ جب وہاں سے مایوس ہوتا ہوں تو خطرناک جنگل میں۔ جس پر کہ دہشت ناک سناٹا چھایا ہُوا ہوتا ہے۔ تجھے ڈھونڈتا ہوں ــــ" مگر ناکام"

کئی دن تیری ہی تلاش میں۔ شہر۔ وادی۔ کوہ چوٹیاں۔ آبشار۔ میدان۔ بیاباں۔ ریگستان ایک کر دیئے ـــــ" مگر تو نہ ملا۔ لیکن تیری تلاش بدستور جاری رہی "

سوتا ہوں تو تخیل اکثر تیری کھوج میں ہوائی گھوڑے پر سوار ہو کر نا معلوم کہاں ہے۔ کہاں پہنچ جاتا ہے ــــ" مگر سب کچھ بے سود "

(۲)

" یہ تمام میری کوتاہ اندیشی ثابت ہوئی "

آخر میں نے تجھے پا لیا - اب تو میرے پاس ہے۔ اِدھر ہے - اُدھر ہے - نیچے ہے - اوپر ہے - گویا جس طرف بھی دیکھتا ہوں - تجھے ہی پاتا ہوں عالم کا ذرّہ ذرّہ تیرے نور سے پُر نور ہے - خورشید و آفتاب تیری ہی ضیا سے روشن ہیں - ننھے ستارے تیرے ہی کرم سے جھلملا رہے ہیں - اب میرے دل کا دروازہ کھل چکا ہے - اور میں تجھے اپنے من کے مندر میں براجمان دیکھتا ہوں -

عورت

(۱) عورت کا دل محبّت کے پانی سے سیراب و شاداب کیا گیا ہے۔
ہمارے قوانین کی نسبت عورت کی نگاہوں میں کہیں
زیادہ طاقت اور اثر ہے ۔۔۔ "شکسپیئر"

(۲) جس مکان میں عورت نہیں۔ سمجھ لو کہ اُس مکان میں
شگفتگی۔ بشاشت اور مسرت کا گذر نہیں ۔۔۔ "ڈامس ہڈ"

(۳) دنیا بھر میں کوئی لعل کوئی ہیرا اتنا بیش بہا نہیں ہوتا جتنی
کہ ایک پاک بازو اور عفتِ مآب عورت۔ خصوصاً جبکہ وہ حسین
بھی ہو ۔۔۔ "رینالڈ"

(۴) عورت دُنیا کی زینت۔ ملکوں کی آبادی اور قوموں کی
عزت ہے ۔۔۔ "حالی"

(۵) اگر دنیا میں عورت نہ ہوتی تو مسرت کا لفظ کسی زبان کی
لغت میں نہ مل سکتا۔ کیونکہ عورت مسرت ہے ۔۔۔ "وُیٹیر"

(۶) عورت کے جذبات محبت اس قدر عمیق ہوتے ہیں کہ اُن کی
تہ تک پہنچنا ناممکن ہے۔ مبارک ہیں وہ ہستیاں جو ان
جذبات کی پر لطف گہرائیوں میں کھو جائیں ۔۔۔ "ہومیر"

(۱)

میں اپنی نظم کا پانچواں شعر موزوں کر رہا تھا۔ یکایک ملازم کے ارتعاش پذیر پاؤں کی آہٹ نے طلسم تخیل کو درہم برہم کر دیا۔ شیرازۂ جذبات منتشر ہو گیا۔ جھنجھلا کر پوچھا۔ ”کیا ہے؟“

اس نے دو ملاقاتی کارڈ میرے سامنے رکھ کر کہا۔

”حضور! دو فرشتے ...“

”فرشتے؟“ —— میں نے استعجاب انگیز نگاہوں سے اُن کارڈوں پر نظر ڈالی۔

ایک کارڈ ہلالئیل اور دوسرا فائیل کا تھا۔ واقعی دونوں فرشتے تھے۔ اور مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میں نے مسرت آگیں انداز سے کہا ”نہائیت احترام سے اندر

لے آؤ“

نظم کے لئے جن تخیلات کا میرے دماغ میں اجتماع تھا۔ اُن کو محو کر کے مسرت جلوہ فگن ہو اٹھی ــــ میرا گھر ــــ اور فرشتے! ــــ میں جیسے خوشی سے دروازہ کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ آئے!!

اُن کا لباس ــــ مختلف اقسام کے رنگ برنگے لیکن نہایت ہی دلفریب پروں کا تھا۔ قوس قزح کی مانند خیرہ کن رنگین شعاعیں لباس سے نکل نکل کر میرے کمرہ میں تجلی ریز ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے سیمیں رنگ کی برف پر خاور اعظم کی احمریں شعاعیں تھرک تھرک کر دلکشی اور دلبستگی کے سامان پیدا کر رہی ہیں۔ کسی پرسے ارغوانی شعاعیں نکل رہی تھیں کوئی گنگا جمنی کرنوں کا احساس کرا رہا تھا۔ ہاتھ کے اشارے سے میں نے انہیں بٹھا کر نہایت نرم لہجہ میں تشریف آوری کا باعث دریافت کیا۔

بلائیل نے خنداں پیشانی اُٹھا کر کہا ”مختصراً یہ ہے کہ!! سولہ سال کا عرصہ ہُوا۔ موسم بہار کی وہ کیف آور

رات تھی۔ ہم دونوں ایک عنبر قالین پر بیٹھے ہوئے آسمان پر عالم اجرام میں انٹا کھیل رہے تھے۔

"معاف کیجئے گا ــــ میں فقرے کے اختتام سے پیشتر ہی بول اُٹھا۔ "میرا خیال تھا آسمان نیلی فام ہے"۔

"ہاں" ــــ ہلائیل نے کہا ــــ گہرائی کی افراط کی وجہ سے آسمان کئی جگہ نیلگوں ہے۔ لیکن ایسا ان کی طرف سے سبزی مائل ہے۔ اور دیدہ زیب"

"میں خاموش سنتا رہا"۔

"انٹے کی بجائے" ــ ہلائیل نے سلسلہ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ہم نے عالم سماوی کے دو سب سے خوبصورت ستاروں کو توڑ لیا تھا۔

"چھڑیاں کس چیز کی تھیں؟"

میں نے پوچھا۔

"ہم نے ــــ ہلائیل نے جواب دیا"۔ دو دُم دار ستاروں کی دُمیں استعمال کی تھیں۔ کھیل نہایت پُر لطف تھا۔ میں غائب تھا۔ اور یا فائیل مغلوب یکایک زور ازور سے مارنے پر دونوں ستارے کنارہ

سے پار ہو گئے۔

"پھر؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"ہاں" کنارہ سے پار ـــــ قالین کے کنارے سے پار ہو گئے۔ میرے دوست۔ یہ امر نہایت تکلیف دہ تھا۔ یہی نہیں بلکہ لرزہ خیز آسمان سے دو ستاروں کا گم ہو جانا قیامت سے کم نہیں ـــــ آہ ـــ اب خداوند تعالیٰ کا حکم ہے۔ کہ!! جب تک ہم اُن دونوں ستاروں کو تلاش کر کے ان کی جگہ آویزاں نہ کر دیں۔ بہشت میں کسی طرح بھی داخل نہیں ہو سکتے۔ نہ راحتِ فردوسی اور عشرتِ آرام سے لُطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ یہ سزا نہایت تکلیف دہ ہے۔ آہ! سولہ سال کے طول طویل عرصہ میں ہم نے کرّہ ارض کا ذرہ ذرہ چھان ڈالا۔ لیکن ستارے نہ ملے اور نہ ملے۔

میں نے کہا۔ "اب کیا ہو گا؟"

"سنو" یوں تو ہم مایوس ہو کر یہ لرزہ خیز سزا تادم حیات بھگتنے کے لئے تیار تھے۔ لیکن ـــــ ہاں ـــ یاس کی ہیبتناک تاریکی میں شعاعِ اُمید منور ہو اُٹھی ـــ

اور اسی لئے اُس اُمید پر آپ کے پاس آئے ہیں۔

"یعنی"! ——— میں نے پوچھا۔

"ہم نے ایک حسینہ کی پُر اسرار آنکھوں کی شہرت سُنی ہے۔ اور وہ آپ کی بیوی ہے"۔

میری بیوی؟

مجھے ایسا احساس ہُوا۔ جیسے کوئی میری گردن پر رسّی کا پھندا ڈال کر کسی تاریک غار کی جانب کھینچ رہا ہے۔

"ہاں" تمہاری بیوی! ——— ہم نے جو کچھ سُنا ہے۔ اگر وہ صحیح ہے۔ تو اُس کی آنکھوں میں فانی انسان کی روشنی جیسی خوبصورتی نہیں ہو سکتی اُن ستاروں میں نورِ الٰہی پنہاں ہے۔ کیا ہم اُمید کر سکتے ہیں۔ کہ وہ ہمارے دونوں ستارے واپس کر دے گی؟۔

جیسے پاؤں تلے سے مٹی نکل گئی۔ میرا سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے روبرو اندھیرا چھا گیا

"آہ"۔ جس کی تجلی ریز روشنی سے میرا خانۂ تاریک بقعۂ نور بنا ہوا ہے۔ وہی آنکھیں کیا مجھ سے چھن جائیں گی؟ کتنا خوفناک مطالبہ تھا۔ گو فرشتوں کی گمشدہ چیز واپس کرا دینا میرے اختیار میں تھا۔ لیکن ـــــ قدرت کی بہترین نعمت واپس کر دوں؟

ـــــ تاہم میں نے اپنی بیوی کو بلا کر سب کچھ بیان کر دیا۔

فرشتوں کے روبرو وہ غیر متزلزل چٹان کی مانند کھڑی تھی۔ کسی پریشانی کا شائبہ تک نہیں۔ پلکوں کو اُٹھا کر بولی۔ نیک فرشتو میری آنکھیں غور سے دیکھو۔ اور ستاروں کو پہچان لو۔

دونوں فرشتے قریب آئے انہوں نے چمکتی ہوئی سحر بار آنکھوں میں اپنی نگاہیں ڈال دیں۔ آپس میں آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔ جیسے دو جج مشورہ کر رہے ہوں، پھر تجاہل عارفانہ سے کہا ـــ "نہیں ـــ نہیں" یہ وہ ستارے نہیں ہیں۔ جو اس سکوت پذیر

رات کے وقت ہماری کوتہ اندیشی سے گم ہو گئے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ستارے موسم بہار کی کیف انگیز رات میں اُنہیں کی طرح ضیا پاشی کر رہے تھے۔ لیکن اُن میں ایسی دل کشی نہ تھی۔ جو ان آنکھوں میں موجود ہے۔

فرشتے مایوس ہو کر لوٹ گئے۔ مجھے اُن کی حالت زار پر رحم آرہا تھا۔ تاہم میں خوش تھا۔ وہ میری بیوی کی درخشاں آنکھیں میرے پاس ہی چھوڑ گئے تھے۔

میری بیوی نے فلک شگاف قہقہہ لگا کر کہا۔

میری ماں نے سُنایا تھا۔ کہ جب میں پیدا ہوئی۔ دریچہ سے داخل ہو کر دو ستارے میری آنکھوں میں جاگزیں ہو گئے تھے۔ لیکن فرشتوں کو میں نے دھوکہ دے دیا۔

تو کیا فرشتے دھوکہ میں آگئے؟"

"ہاں" جب وہ میری آنکھیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے اُن کے روبرو تخیل گذشتہ کی لہروں کا جال تن دیا تھا۔

ہاں میرے پیارے پہلی بار۔ جب تم نے وفورِ محبت سے بیتاب ہو کر وارفتہ وار مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہا تھا۔ "جانِ من"! میں خوب جانتی تھی۔ کہ اِس وقت کا وجد آفرین تخیل میری آنکھوں کو ہی نہیں بلکہ قلب کے دوستاروں کو کہیں دلفریب دلکش بنا دیگا۔

"فرانسیسی"

حسن کا جادو

(۱)

وہ زاہد تھا - آٹھوں پہر ریاضت میں مشغول رہنا اس کا واحد کام تھا - دریائے راوی کے کنارے اس کی ایک معمولی پھولنس کی جھونپڑی تھی - اُس کی سفید ڈاڑھی بارونق چہرہ - کمرہ میں قدرے خم اور منور آنکھیں جادو اثر رکھتی تھیں - لوگ بے ساختہ کسی مقناطیسی قوت کے زیر اثر اُس کی جانب کھچے چلے آتے تھے - جس وقت آفتاب عالمتاب دن بھر کی مسافت طے کر کے گوشۂ مغرب میں روپوش ہوتا - اور شفق کی سرخی مائل خوشنما روشنی آسمان پر کھلنے لگ جاتی - تو ایسے منظر کے وقت بہت سے خدا پرست لوگ اس کے گرد اکھٹے ہو جاتے - اور وہاں کافی دیر تک دھرم کرم

کی باتوں کا چرچا ہوتا رہا۔

لوگ اُسے دیوتا سمجھتے اور اس کے عالمانہ الفتِ حق میں ڈوبے ہوئے اپدیشوں نے اس کی بزرگی کا سکہ اُن پر مضبوطی سے بٹھا دیا۔ لوگ گھروں کو لوٹ جاتے۔ تو وہ جھونپڑی میں واپس آجاتا۔ اور شب کے بقیہ لمحات ایشور بھگتی میں صرف کر دیتا۔

اس کا ایک چیلہ تھا۔۔۔ رنگ ناتھ۔! جوان خوبصورت اور سڈول! اُس کے نقش و نگار پتھر دل کو بھی رام کر لیتے تھے۔ بچپن سے ہی وہ مہاتما جی کے ساتھ تھا۔ اور جوان ہونے تک وہ بھی ایشور کی بھگتی اور مہاتما جی کی سیوا میں لگا رہا۔

(۲)

اندرا ایک حسن فروش حسینہ! اگرچہ خود کو بازارِ حسن میں فروخت کر چکی تھی۔ اور ایک ذلیل ترین پیشہ اختیار کئے ہوئے تھی۔ تاہم حقیقت میں وہ ایسی نہ تھی۔ سینہ پر پتھر رکھ کر وہ مجبوراً یہ ناپاک فعل انجام دیتی تھی۔ ورنہ اس کے سرد سینہ میں بھی لاکھوں چنگاریاں دفن تھیں۔ جنہیں ظاہر کرنا اُس کی طاقت سے باہر تھا۔ بسا اوقات

وہ عالم تخیل میں کہہ اٹھتی " بھگوان! کیا دنیا کو مجھ جیسی عورتوں کی بھی ضرورت تھی؟"

جب اس کی طبیعت حد درجہ غمگین اور بے چین ہوتی تو وہ لبِ دریا جاکر اپنا غم غلط کرنے کی ناکام سعی کرتی۔ مگر اس سے اُس کی بے چینی بجائے کم ہونے کے بڑھ جاتی۔ ایک روز وہ دریا کے کنارے ٹہل رہی تھی...... کہ اچانک اس کی نظر رنگ ناتھ پر جا پڑی۔ جو اپنی کشکول کو دریا میں ڈبو رہا تھا۔ اُس کی نرگسی آنکھیں بھی سطح آب سے اُٹھ کر اندرا کی نرگسی آنکھوں سے دوچار ہوگئیں۔

رنگ ناتھ کو ایسا معلوم ہُوا۔ کہ جیسے آسمان پر بجلی کوندی اور اس کے تمام جسم میں کپکپی پیدا ہوگئی۔ عشق کے اندھے دیوتا کا تیر اُس کی آنکھوں کے راستے سے داخل ہوکر دل میں پیوست ہوگیا۔

(۳)

اندرا نے سادھو کی کٹیا پر روزانہ آنا۔ اپنا معمول بنا لیا۔ وہ آتی اور گھنٹوں رنگ ناتھ کے ساتھ پیار و محبت کی گفتگو میں مشغول رہتی۔ رنگ ناتھ بھی اب وہ پہلا رنگ ناتھ نہ رہا۔ اس کی حالت میں انقلاب آگیا۔ اُس کے

آئینہ دل میں اندرا کی تصویریں نقش رہتی - اور وہ ہر وقت نہایت بے چینی کے ساتھ اُس کی آمد کا منتظر رہتا. اندرا آتی تو رنگ ناتھ پر کیف طاری ہو جاتا - جیسے چکور چاند کو دیکھ کر بے خود ہو جاتا ہے،، یا موسم بہار میں کوئل پر خود رفتگی کا عالم طاری ہو جاتا ہے.

رنگ ناتھ اندرا کے عشق میں اپنا ایشور بھگتی سے لبریز دل کھو بیٹھا -

(۱۴)

ایک روز مہاتما جی نے رنگ ناتھ کو اپنے پاس بُلا کر کہا -

رنگ ناتھ! تم نہایت خوفناک راستہ اختیار کئے ہوئے ہو - جو یقیناً تمہاری تباہی کا باعث ہوگا -

ڈگورو دیو! میں بالکل بے بس ہوں - اور ساحرہ کے سحر سے مسحور ہوں "-

لیکن یاد رکھ! تو جس راستہ پر گامزن ہے - وہ بڑا بھیانک اور خار دار ہے - قدم قدم پر تکلیفوں اور مصیبتوں کے خونخوار اژدہے مُنہ کھولے ہوئے ہیں - اب بھی وقت ہے - سمجھ جا . . . . اور سنبھل جا!!

"مگر...... گورو دیو"!

کچھ بھی ہو۔ تمہارے سامنے اس وقت دو راستے ہیں۔
ایک صاف سیدھا اور بے خطر ہے۔ مگر دوسرا تباہ کن
اور خطرناک! تم جو راستہ اختیار کرنا چاہو۔ آج کر لو۔ یا
تو آج سے اندرا سے ملنا ترک کر دو۔ یا آج اس
جھونپڑی کو خیرباد کہو۔

"گورو دیو!.... مہلت!!"

"نہیں۔ مہلت ہرگز نہیں مل سکتی۔ جو کچھ سوچنا ہے۔
اُسے ابھی کہہ ڈالو"!

دوسرے دن، نہ بازار حسن میں اندرا تھی۔ اور نہ
پھولُس کی جھونپڑی کے دروازہ پر رنگ ناتھ! ہے

غضب کی چیز ہے یہ حسن انسان لاکھ بچتا ہے
مگر دل کھنچ ہی جاتا ہے، طبیعت آ ہی جاتی ہے

عورت کی ساخت

۱- ماہ کامل کی تجلی
۲- ضیاء کا تابش حسن
۳- بید مجنوں کی دلفریب لچک
۴- سانپ کی مست خیز چال
۵- باد صرصر کی وضاعت اور سحاب مزاجی
۶- معطر پھولوں کی پرکشش مہک، نزاکت اور رنگینی شگفتگی
۷- طاؤس کی خود پرستی
۸- آہو کی چالاک، شوخی - الفت آمیز پر کیف آنکھیں
۹- طوطے کا شور
۱۰- کبوتر کی صم بکمی
۱۱- بوعیدن کی پیچیدگی
۱۲- تیر کی سیدھ
۱۳- آتش کی تپش
۱۴- برف کی ٹھنڈک
۱۵- خرگوش کی بزدلی
۱۶- ضبورہ کی خارہ دلی
۱۷- ہیرے کی سختی
۱۸- موم کی نرمی
۱۹- شہد کی مٹھاس
۲۰- صبر کی کڑتن
۲۱- بجلی کی تڑپ
۲۲- قطب کی ساکنی
۲۳- چٹان کی مضبوطی
۲۴- پتوں کی تھرتھراہٹ
۲۵- طلا کا وزن
۲۶- پروں کا ہلکا پن
۲۷- شتر کا کینہ
۲۸- ابر باراں کی زاری

ان تمام وصافی منتشر اوصاف کو یکجا کر کے قدرت نے ایک مجموعہ بنایا اور اپنی بے نظیر و پراسرار پیچیدہ صنعت کا راز طشت از بام کر دیا۔ پھر صنف نازک کے نام سے منسوب کر کے مرد کی نذر کیا۔

محبّت کی دُنیا

صبح کا فرحت خیز وقت تھا۔ سورج نئی بیاہی دُلہن کی طرح شرمیلی نگاہوں سے سُرخ چادر میں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہا تھا۔ مشرق کی طرف آسمان پر سرخی چھا رہی تھی۔ شاید یہ خون تھا۔ جو شب کی دیوی کی لاش سے نکل رہا ہو۔ جس کو دن کے دیوتا نے قتل کر دیا تھا!

گلشن پر بہار میں عندلیبان سخن نغمہ سرا تھے۔ چمن کے ذرّے ذرّے میں رعنائی تھی ـــ حسن تھا۔ لڑکپن کی شوخی تھی۔ عطر بیز ہوا کے خوشگوار جھونکے دماغ کے پردوں کو ہلا ہلا کر دل پر قبضہ کرنے کی بے سود کوشش میں مشغول تھے۔ کیونکہ اس پر کسی اور کا تسلط تھا۔

مولسری کے درخت کے تنے کے ساتھ کمر لگائے گفتگو محبت میں غرق تھے - ہمیں اس دُنیا کے کام کی ـــــ گردش کی ـــــ مطلق پرواہ نہ تھی - ہماری دنیا ـــــ محبت کی دنیا ـــــ اس فانی دنیا سے بالکل مختلف تھی - عالم کے جھگڑوں سے دور ـــــ بہت دُور ـــــ

میں نے اس کی نگاہیں میں معنی خیز نگاہیں ڈالیں - وہ میری آغوش میں گر گئی - اُس نے اپنی کالی کالی آنکھیں میری طرف اٹھائیں - اور پھر بار حیا سے بند کرلیں - میری انگلیاں اُس کی عنبریں زلفوں سے کھیل رہی تھیں - ہم دونوں کے لب وصال کے لیے بیقرار تھے -

زلزلہ آیا - کائنات کا ذرہ ذرہ لرز اٹھا سر بہ فلک پہاڑیاں سرنگوں ہو گئیں - پستی پسند آب آسمان کو ہم کنار کرنے کی سعی کرنے لگا - بحروبر میں کوئی نمایاں فرق نہ تھا -

ہم کسی دوسری دنیا میں خرام ناز کنے ـــــ ہمیں کچھ بھی خبر نہ تھی - کہ کیا ہو رہا ہے ـــــ

اس طوفان سے کوئی نہ بچ سکا۔ زمین و آسمان میں امتیاز کرنے والا کوئی نہ رہا۔ خون کی ندیاں بہ نکلیں۔ وادی و کوہسار لاشوں سے پٹ گئے۔

شاید ــــ اس کا نام قیامت تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ انسانی شکل اس طرح معدوم ہو چکی تھی۔ جیسے کبھی عالم وجود میں آئی ہی نہ ہو۔

اب گلشن میں کوئی نغمہ سرا نہ تھا۔ تمام شجر و گل زمین بوس ہو رہے تھے۔ وہ پیڑ جس کے سہارے ہم بیٹھے تھے گر چکا تھا۔ مگر ہمیں گیا!!"

ہماری کائنات اس کائنات سے مختلف تھی۔ وہ اب بھی میری آغوش میں تھی۔ میری نظریں اس کی نظروں میں تھیں۔ میری انگلیاں اس کی عنبریں زلفوں سے کھیل رہی تھیں۔ ہمارے ہونٹ اب بھی ہلکی سی جنبش کرتے نظر آ رہے تھے۔

"رازِ چہچہاہٹ"

کیا تم نے کبھی غور کیا ہے؟
کہ چڑیا اور فاختہ کیا کہتی ہے؟

انگلستان و ترکی کی چڑیا یہ کہتی ہے۔ "میں پیار کرتی ہوں اور پیار کرتی ہوں"!

سردیوں میں جب وہ خاموش ہوتی ہیں۔ اور ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ اس وقت جو کچھ کہتی ہے۔ میں نہیں جانتا۔ وہ ایک اونچا راگ گاتی ہے۔ لیکن ہرے ہرے پتے ـــ دھوپ والا موسم گرما... گانا اور محبت کرنا۔ سب اکٹھے واپس آتے ہیں "میں پیار کرتا ہوں "غالباً" تمام پرندے کہتے ہیں۔

صبح سے لیکر شام تک وہ بہت خوش رہتے ہیں۔ مگر چنڈول ان سب سے زیادہ خوش ہوتا ہے۔

سبز کھیت نیچے اور نیلگوں آسمان اوپر دیکھکر اتنا مست ہو جاتا ہے اور گاتا ہے۔ ہمیشہ گاتا ہے۔

"میں اپنی محبوبہ سے پیار کرتا ہوں۔ اور میری محبوبہ مجھ سے پیار کرتی ہے"!

مُصوّر

(۱)

مصور نے اپنے نئے شاہکار کو جس پر اُس کے دماغ کی تمام قوتیں صرف ہو چکی تھیں . . . ہاتھ میں اٹھائے ہوئے کہا ۔

"بہت خوب! بہرادب کے ایڈیٹر کے دماغ میں جگہ کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ہے ۔ آج وہ جامے میں پھولا نہ سمائے گا ۔ اس قسم کا نیا تخیل تو میرے خیال میں آج تک کسی بھی ادبی رسالے نے شائع نہیں کیا" پھر اپنے ہاتھوں کو بوسہ دیتے ہوئے بولا ۔

"ہاں تم نے وہ کام کیا جو آج تک اعلےٰ سے اعلےٰ مصوّر بھی نہ کر سکا ہوگا ۔ بس اب ایک ماہ آرام کی ضرورت ہے" مگر آرام کہاں ایڈیٹر نہایت سنگدل واقع ہوا ہے ۔ پچھلے سال بھی تو اسی طرح کا ایک بالکل نیا تخیل پیش کیا تھا ۔ مگر اجرت

وہی معمولی - ایگور جانے آج کیا ظہور میں آتا ہے۔ مگر آج بھی اس نے ایسا ہی کیا تو اس کام سے دست بردار ہو جاؤنگا -
مکمل ایک ماہ یا پانچ دن کی محنت کا خمیازہ کیا وہی ملے گا - جو دس دن کی محنت سے دستیاب ہو سکتا ہے۔ مگر نہیں - پھر بھی اُس کی آنکھیں ہیں - دماغ ہے - اور ان تمام باتوں کے باوجود وہ قیافہ شناس قابل فہم تجربہ کار ایڈیٹر ہے "
خود بخود اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے مصور اُٹھا۔ الماری سے کاغذ نکالا - تصویر کو اس میں اچھی طرح لپیٹا - اپنا پھٹا پرانا کوٹ اُتار کر پہن لیا - خستہ حالت چارپائی سے پگڑی اٹھا کر سر پر رکھی - ان تمام کاموں سے فرصت پا کر کمرے میں ایک بھڑکتی ہوئی نگاہ ڈالی - جس میں اُس کی خود ساختہ اور کئی کسی کی یادگار تصاویر آویزاں تھیں "
اس کے بعد اُس نئی تصویر کو اٹھا کر کمرے سے باہر نکلا - دروازہ مقفل کرتا ہوا - شہر کی جانب روانہ ہو گیا - اور اس انداز سے ٹہلتا ہوا - جھومتا ہوا چلا جا رہا تھا - جیسے قارون کا خزانہ ہاتھ آنے والا ہے "

(۲)

دیوان چند معمولی دوکاندار تھے۔ ان کا کاروبار کوئی

زیادہ وسیع نہ تھا۔ گذارے کیلئے کمائی تھی۔ بزرگوں کی پونجی لڑکی کی شادی پر صرف ہو چکی تھی۔ ایک لڑکا تھا۔ جو اس سال مڈل کا فائینل امتحان دینے والا تھا۔ بھگوان نے انہیں یہی دو بچے عطا کئے تھے۔ اس نازک زمانہ میں روپیہ جمع کرنا بساط سے باہر ہے۔ لڑکا جوان ہو رہا تھا۔ دیوان چند کو خیال تھا۔ کہ لڑکے کی شادی جلدی ہو جائے۔ مگر روپیہ کچھ کرنے نہ دیتا تھا۔

وقت گذرتے دیر نہیں لگتی۔ دنوں کے بعد مہینے اور مہینوں کے بعد سال گذر گئے۔ پریم ناتھ میٹرک میں کامیاب ہو گیا۔

اس گور کلجگ کے عالم میں ہوشیار، دیانتدار۔ محنتی اور تمام عیبوں سے بالاتر لڑکا ملنا نہایت ہی مشکل ہے۔ مگر ایشور کی قدرت یہ تمام باتیں پریم ناتھ میں موجود تھیں۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ پتا کی دوکان پر ہی بیٹھ گیا اور اس نے بتا دیا کہ کاروبار کو اس طرح عروج پر پہنچایا جا سکتا ہے۔ دو سال کے قلیل عرصہ میں ہی سگائیوں کے لئے کئی جگہ سے فرمائش آئیں۔ مگر دیوان چند ایک نہ مانتے تھے۔ وہ یہ بات خوب جانتے تھے۔ کہ اب کاروبار میں اضافہ

ہو رہا ہے - لڑکا ہونہار ہے۔ ایسے لڑکے کے لئے کسی اچھے خاندانی اور امیر گھر کی لڑکی ہی آنی بہتر ہے۔

وہی ہوا جو دیوان چاہتے تھے۔ مدراس کے ایک ساہوکار نے دیوان چند سے آکر کہا۔ کہ لڑکا میرا ہو چکا۔ دیوانچند اس کو انکار نہ کر سکے۔ انہیں معلوم تھا۔ کہ ان کا کاروبار لاکھوں کے میدان میں گامزن ہے۔ ہمیں مالا مال کر دیں گے۔ لڑکے کی قسمت بیدار ہو چکی ہے!

باتوں باتوں میں معلوم ہُوا کہ لڑکی کی ماں کو اس جہان سے رخصت ہوئے دس سال کا لمبا عرصہ گذر چکا ہے۔ مگر دیوانچند نے اس بات کی کوئی خاص حقیقت نہ سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیا۔

چھ ماہ کے بعد پریم ناتھ کی شادی بڑی شان وشوکت سے ہوئی۔ لڑکی والوں نے توقع سے زیادہ جہیز دیا۔ دیوان چند کی باچھیں کھل گئیں۔ مگر جو قرض لڑکے کی شادی پر لیا تھا۔ وہ اُسی طرح سر پر ہی رہا۔ بے شک جہیز میں سینکڑوں کے کپڑے آئے۔ مگر کیا انہیں بازار میں فروخت کرتے۔ ہزاروں کے زیورات ملے تھے۔ مگر انہیں بھی فروخت کرنے سے ناک نہیں بچ سکتی تھی۔ جو کچھ روپیہ ملا تھا۔ وہ ادھر

اُدہر کے حساب میں ختم ہوگیا۔
پریم ناتھ کو شادی کے دو ماہ بعد بیوی کا مُنہ دیکھنا نصیب ہوُا۔ پریم ناتھ کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ بیوی حسین تھی۔ طرح دار تھی۔ اُس کی آنکھیں جادو سا اثر رکھتی تھیں۔ اُس کی ہر ادا پریم ناتھ کے دل و جگر میں پیوست ہو رہی تھی۔ مگر یہ تمام خوشی دس دن کے تھوڑے عرصہ میں ہی کر کری ہو گئی۔

اُس کی بیوی کچھ عجیب قیاس کی واقع ہوئی تھی۔ اُسے جو بات کہی جاتی اس کے برخلاف چلنا اُس کا واحد کام تھا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی۔ کہ کچی عمر میں ہی تارا کی ماتا دوسرے جہان میں چلی گئی تھی۔ اب اُس کو سمجھانے والا کون تھا۔ جو اُس کے دل میں آتا کرتی۔ والد تھے۔ وہ صبح اپنی آڑہت کی دوکان پر چلے جاتے۔ پھر کیا تھا۔ تمام دن لڑکیوں میں کھیل کود کر ختم ہو جاتا۔ تارا کا ایک بھائی تھا۔ ودیا ساگر۔ بی۔ اے پاس کرنے کے بعد اُس کی شادی ہو گئی۔ بیوی نہایت سلیقہ شعار۔ ذہین اور قابل تھی۔ ہر ایک بات کی طہ تک پہنچتی تھی۔ اُسے تارا کا یہ تمام دن کا پروگرام پسند نہ آیا۔ اُس نے آہستہ

آہستہ شیریں گفتار سے تارا کو سمجھانا شروع کیا۔ مگر تمام بے سود۔ اُس کا نتیجہ ہی مقابل نکلا۔ تارا نے اپنے والد سے کئی طرح کی جھوٹی شکائتیں لگانی شروع کر دیں۔ کئی آدمی کچھ عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔ یک طرفہ ڈگری دے دینا اُن کے لئے معمولی بات ہے۔ تارا کے والد نے بہو کو سخت سست کہنا شروع کر دیا۔

بملا نہایت ہوشیار تھی۔ صرف اشارے سے ہی سمجھ گئی۔ کہ یہ بات ہے۔ اُس کے بعد اُس نے تارا کو سمجھانا تو درکنار کوئی کام کہنا بھی ترک کر دیا۔ تھوڑے عرصہ کے لئے تارا کے آگے ایک چٹان کھڑی ہو گئی تھی۔ جو اس نے تھوڑی سی ہمت کے ساتھ دُور پھینک دی۔

(۳)

تارا نے اپنی تیرھویں سالگرہ میں قدم رکھا۔ زمانہ خراب تھا۔ تارا عالم شباب میں تھی۔ اُس کا خداداد لاثانی حُسن آنکھوں کے راستے اُتر کر دل پر۔ اپنا تسلّط جما لیتا تھا۔ اُس کی عنبریں زلفیں زہریلے سیاہ سانپ سے کم نہ تھیں۔ اُس کی سرمگیں آنکھیں زہر میں بجھے ہوئے تیر تھے۔

چونی انٹرینس میں پڑھتا تھا۔ نیک تھا۔ خوش مزاج

تھا۔ ہنس مکھ تھا۔ مگر کسی نے خوب کہا ہے۔ جوانی مستانی ہوتی ہے۔ چونی کا بھی وہی حشر ہُوا۔ وہ تارا کے دامِ محبت میں گرفتارِ بلا ہوگیا۔

صبح سکول میں جاتا مگر دل شمع تارا کے گرد پروانے کی طرح گھوما کرتا۔ گھر آتا تو تمام دن کھڑکی میں بیٹھ کر گذار دیتا۔ جب کبھی تارا نظر آتی۔ تو دل پر ہاتھ رکھ کر ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتا۔

تارا کا والد زمانہ ساز تھا۔ اُس نے پرانے زمانے کی تعلیم حاصل کی تھی۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھ گیا۔ کہ دال میں کالا ضرور ہے۔ اب تارا کی شادی کا سوال دامن گیر ہُوا۔ اُس کے بعد جو کچھ ہُوا۔ وہ ناظرین جانتے ہیں۔

مگر چونی اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہ ہُوا۔ اور نہ ہی میٹرک کے امتحان میں پاس ہوسکا۔ اُس کا دل ٹوٹ گیا اس نے اُسی سال سکول کو خیر باد کہا۔

(۴)

پریم ناتھ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہُوا۔ اُس کی زندگی خاردار ہوگئی۔ وہی پریم جو ہر لحظہ خوش و خرم تھا۔ اب مغموم نظر آنے لگا۔ بیوی نے اُسے ناکوں چنے چبوا دیئے۔

اُس پر طرّہ یہ کہ ناتجربہ کاری نے اُسے دوکان کے کام سے بھی بے فکر کر دیا۔

بزرگوں نے سچ کہا ہے۔ کہ قرض مہاجنی ہے۔ ماہ بہ ماہ بڑھتا ہی جاتا ہے۔ یہی حال دیوان چند سے ہوا۔ قرض بڑھنے لگا۔ آمدنی کم ہوگئی۔ مگر وہ لڑکے کو بھی کیا کہہ سکتے تھے۔ پریم کی پُرنم آنکھیں دیکھ کر اُن کا دل بیٹھ جاتا۔ یہ پریم کے کسی پچھلے جنم کا پھل تھا۔

پریم کی آہ رسا نے خوب کام کیا۔ اُس کے نالے فلک کے پردوں کو چیرتے ہوئے خالق کے کانوں تک جا پہنچے۔ تارا کو امیدواری ہوگئی۔ پھر مقررہ دنوں کے بعد اُس کے بطن سے لڑکی پیدا ہوئی۔

دیوان چند کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اس نے دل میں خیال کیا۔ اب لڑکی سُدھر جائے گی۔ اور پریم کی زندگی رنگین بن جائے گی۔ مگر دل کی باتیں دل میں ہی رہ گئیں لڑکی تولد ہونے کے بعد تارا چارپائی سے نہ اُٹھ سکی۔ اس کی لاش ہی گھر سے نکلی۔ پریم نے دل ہی دل میں خالق کا شکریہ ادا کیا۔

شیر خوار بچہ ایک ہوشیار دایہ کے حوالے کر دیا گیا۔

وہ اُس کی پرورش میں ہمہ تن محو ہو گئی ۔ اب پریم کی دوسری شادی کی تیاریاں ہونے لگیں ۔ مگر پریم کو مطلق خبر نہ تھی ۔ اپنے شہر میں ہی ایک ساہوکار سے بات پکی کر کے دیوانچند نے پریم سے کہا ۔ وہ جیسے خواب سے چونک پڑا ۔ اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے ۔ تمام جسم تھرا اُٹھا ۔ سر سے پاؤں تک ایک برقی لہر دوڑ گئی ۔

اُس نے کہا ۔

پتا جی کیا میں نے پہلی شادی میں راحت کا دیدار کیا ہے ۔ جو اب آپ مجھے دوسری شادی کے لئے کہہ رہے ہیں ۔ آپ سچ سمجھیں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ شادی کے بعد انسان کی درد شا ہوتی ہے ۔ تو میں کبھی بھی اس خوفناک دلکش صحرا میں قدم نہ رکھتا ۔ اچھا وہ تو جو ہو گیا سو ہو گیا ۔ مگر اب مجھے اس دہشت خیز گڑھے میں نہ دھکیلیں ۔ زیست کے جو چار دن باقی ہیں ۔ انہیں آرام سے گذارنے دیں ۔ اگر ایشور کو منظور ہوا تو بچی کی شادی دیکھ لیں گے ۔ اب تو یہی بڑا رکھشا ہے ۔

دیوانچند نے لاکھ سمجھایا مگر پریم کی ہٹ اٹل تھی ۔ وہ

طوفان خیز سمندر میں تھا۔ جیسے پانی کے غضب ناک تھپیڑے بھی نہیں ہلا سکتے۔ پریم کو اس کی ماں نے بھی خوب سمجھایا۔ مگر پریم کی نہیں نہیں تھی!

والدین جھکنے کو تو جھک گئے۔ مگر انہیں یہ غم اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا گیا۔ پریم کی والدہ کمزور تھی۔ وہ اسی غم سے نڈھال ہو کر دوسرے سال اس عالم سے رخصت ہو گئی۔

اب دیوان چند اور پریم کا سہارا صرف وہ تین سال کی لڑکی تھی۔ مگر فرشتہ اجل یہ دیکھتا اور مسکرا دیتا۔ شہر میں چیچک کی نامراد بیماری پھیل گئی۔ پریم کی لڑکی بھی اُس سے محفوظ نہ رہ سکی۔ اور تیسرے دن دوسری بے فکر دنیا کی طرف کوچ کر گئی۔ دیوانچند بشدت غم سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئے۔ ان کے روندھے ہوئے گلے سے نکلا۔ بھگواں تمہاری مایا۔

دیوانچند بے ہوش ہو گئے۔ مگر یہ بے ہوشی مسلسل ہی رہی۔ ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ ہارٹ فیل ہو گیا ہے۔ پریم بیچارہ ناتجربہ کار اس عالم خون ریز تلاطم میں اکیلا محض اکیلا تھا۔

دیوان چند کی آنکھیں بند ہوتے ہی قرض خواہوں نے پریم کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اُس نے خیالاً اندازہ لگایا کہ قرضہ جائداد سے کہیں زیادہ ہے۔ خود بخود ندامت سے سر جھک گیا۔ پیشانی پر سرد پانی کے قطرے نمودار ہوئے۔ پانچویں دن پریم کو تمام شہر میں تلاش کرنے کے بعد بھی پولیس نہ پا سکی!

(۵)

کدار دہلی کا مشہور آرٹسٹ تھا۔ مگر دنیا سے بالاتر۔ جیسے کنول کا پھول پانی میں رہتے ہوئے بھی پانی سے جدا ہوتا ہے۔ یہی حال کدار کا تھا۔ اُس کی شہر کے باہر پھوس کی جھونپڑی تھی۔ مگر اندر قدم رکھتے ہی انسان محو حیرت رہ جاتا تھا۔ اُسے کوئی نئی دنیا وہاں نظر آتی تھی۔ اُس کی جھونپڑی کے مختصر کمرے میں کروڑ ہا روپے کے تخیل تصاویر کی شکل میں آویز تھے۔

مکمل ایک ماہ کے پیدل سفر کے بعد پریم اُس جھونپڑی کے دروازے پر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد آواز آئی

"کون ہے؟"

"ایک بھولا بھٹکا مسافر!"

اس کے بعد دروازہ کھولا۔ ایک لمبے قد کے دُبلے پتلے آدمی نے باہر سر نکالا۔

"کیا چاہتے ہو؟"

"صرف رات بسر کرنی ہے"۔ پریم نے عاجزی سے جواب دیا۔"

"بھائی تم لباس سے امیر معلوم ہوتے ہو۔ کسی ہوٹل میں جاؤ اس بے سرو سامانی جھونپڑی میں کیا کرو گے؟۔ جہاں دو پھٹی پرانی چٹائیاں اور چند برتن کے سوا کچھ بھی نہیں۔"

"میں دُنیا کے خوفناک ہاتھوں سے ستایا ہُوا بے یار و مددگار انسان ہوں۔ جس کے لئے ہوٹلوں میں جگہ نہیں"۔

کدار کے دل میں یہ لفظ تیر کی طرح لگے۔ اُس نے پریم کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اندر لے گیا۔ کدار کی یہ تمام شب پریم کی افسوس زدہ دلچسپ داستان سنتے سنتے ختم ہو گئی۔ پھر اس کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ پریم اب کسی جگہ نہیں جا سکتا۔ اسی جھونپڑی میں رہے گا۔

اس بات کو دس سال کا لمبا عرصہ گذر گیا۔ شام کا وقت تھا۔ پرندوں کے غول کے غول اپنے گھونسلوں کی طرف جا رہے تھے۔ کوئل نے بھی الوداعی راگ چھیڑ رکھا تھا۔

جھونپڑی کے گرد پھلواڑی میں پپیہا کہا - پی کہاں کی صدا لگا رہا تھا - جھونپڑی کے اندر پریم ہاتھوں میں برش لئے صبح کے نکلتے ہوئے سورج کی کرنیں ایک پردے پر بنا رہا تھا - اُس کے پاس ہی کدار سر جھکائے کسی گہرے خیال میں مستغرق بیٹھا تھا - یکایک کدار نے سر اٹھایا - اور نہایت شیریں لہجہ میں کہا -

"بس اب تم نے میری جگہ پر مکمل طور سے قبضہ کر لیا ہے - تم اس کام میں مجھ سے ایک قدم آگے نکل گئے ہو - اب مجھے اجازت دو تاکہ میں کسی جنگل میں جا کر ایشور کو تلاش کروں - دیکھو کام کرتے کرتے کمر میں خم آگیا ہے - آنکھوں کی بینائی آدھی سے زیادہ کم ہو چکی ہے - اب اس دُنیا سے دل بیچین ہے - کافی رنگ دیکھے ہیں - اب زیادہ دیکھنے کو دل نہیں چاہتا - کیوں پریم سُنتے ہو؟"

پریم نے سر اُٹھایا - اور کدار کے چہرے پر پُرنم آنکھوں سے ٹکٹکی باندھتے ہوئے کہا -

"ہاں سب سن رہا ہوں - مگر کیا سُن رہا ہوں - یہ ابھی تک نہیں سمجھ سکا - ایشور جانے آج آپ کیسی دل ہلا دینے والی باتیں کر رہے ہیں - آپ میرے رازق ہیں - آپ کی بدولت میں

اس جہان میں زندہ ہوں۔ آپ کی مہربانی سے ہی میری زندگی کی یہ چند ناخوشگوار لمحے خوشی میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ یہ تمام باتیں ہوتے ہوئے بھلا میں آپ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں میرے لئے تو سب کچھ آپ ہی ہیں۔ سیوک کو گلے لگا کر نہ ٹھکرائیں"۔

کدار نے لمحہ بھر سوچنے کے بعد پھر سر اٹھایا۔ اور اپنی اندر کو دھسی ہوئی آنکھیں پریم کے چہرے پر لگاتے ہوئے کہا

—— سچ کہتے ہو مگر یہ سب کچھ کرنے والا بھگوان ہے۔ بھلا میری کیا بساط تھی۔ انسان کے دل میں کچھ ہوتا ہے۔ مگر قدرت کے دل میں کچھ اور۔ انسان بناتا ہے۔ اور قدرت گرا دیتی ہے۔ انسان گراتا ہے تو قدرت اُسے کھڑا کر دیتی ہے۔ ایشور کی باتیں اتھاہ ہیں۔ میں تو کوئی چیز ہی نہیں۔ صرف اُس کا بھیجا ہُوا ناقابل فہم۔ نکما۔ بیوقوف۔ اور زندگی سے بیزار ہُوا ہُوا ایک کھلونا ہوں۔

پریم نے عاجزانہ لہجہ میں کہا۔" تو مجھے بھی ساتھ لے جائیں"۔

"جب تمہارا موقعہ ہوگا۔ تم خود ہی چلے جاؤ گے۔ میرے ساتھ لے جانے یا نہ لیجانے کی چنداں ضرورت نہیں ——

ہاں میری نصیحت یاد رہے"۔

"دوبارہ یاد کو تازہ کرا دیں۔

"اپنی ایک تصویر فروخت کرنے کے بعد دوسری اس وقت بنانا جب پہلے روپے ختم ہو جائیں۔ امیرانہ ٹھاٹھ میں رہنے کی ضرورت نہیں۔ اس پھوس کی جھونپڑی میں غریبی کی حالت میں رہنا ــــ میں خوب جانتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو ہزاروں روپے پیدا کر سکتے ہو۔ تم کامیاب تصویر نگار ہو۔ مگر یاد رہے امیروں کے گھر میں اس کا گزر نہیں۔ امیر ظالم۔ شفاق اور بے رحم ہوتے ہیں۔ مزدوروں کا خون چوسنا اُن کا سب سے اول کام ہے۔ وہ امیر ہی نہیں بنا۔ جس نے غریب کو ہڑپ نہیں کیا۔ مگر برخلاف اس کے پھوس کی کٹیا میں۔ غریبوں کی جھونپڑی بھگوان کی نگاہیں رقص کرتی ہیں۔ اس کی دلکش ہنسی کی آواز کانوں میں گونجتی ہے۔ غریبی میں کوئی فکر نہیں۔ مگر امیری میں ہمیشہ جان و مال کا فکر دامن گیر رہتا ہے۔ پریم میری اس نصیحت کو بھولنا نہیں دل پر نقش کر لینا۔ کام کی باتیں ہیں"۔

اسی رات پریم کو بے خبر چھوڑ کر گدار جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

(۶)

آج تین ماہ بعد ایک مہینے کی کوشش سے پریم نے ایک تصویر تیار کی تھی۔

رام لعل راحت بہر ادب کے ایڈیٹر تھے۔ پرچہ کامیاب تھا۔ نئے نئے شاہکار۔ عمدہ تصاویر۔ بلند پایہ نظمیں یہی وجہ تھی کہ اُسے کافی مقبولیت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے راحت صاحب کا دماغ بھی عرش بریں پر پرواز کرتا تھا۔ کسی معمولی آدمی کی اُن کی آنکھوں کے سامنے کوئی حقیقت نہ تھی۔

ایڈیٹر صاحب دفتر میں تشریف فرما تھے۔ کہ پریم کمرے میں داخل ہوا۔ راحت نے ایک بار میز سے آنکھیں اوپر اٹھائیں اور پھر مضمون لکھنے میں محو ہو گئے۔

پریم پانچ منٹ کھڑا رہنے کے بعد بولا "ایک نئی تصویر لایا ہوں"

"ہاں بیٹھو۔ مجھے تھوڑا سا کام ختم کر لینے دو"

پریم پاس پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کامل ایک گھنٹہ بعد ایڈیٹر صاحب نے سر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"دکھاؤ"

پریم نے تصویر آگے رکھ دی۔ ایڈیٹر صاحب پر سکتہ

طاری ہوگیا - کبھی تصویر اور کبھی پریم کی طرف دیکھتے - مگر جلدی ہی اپنی حیرانی کو دور کرتے ہوئے بولے -

"بہت تنگ وقت میں آئے ہو - ہمارا پرچہ بتیس ۳۲ تاریخ کو شائع ہونے والا ہے - ہاں ایسے چھوڑ جاؤ - پہلی تاریخ کو اپنا حساب لے جانا - کام زیادہ ہے - اور وقت ناکافی - اس لئے کہتا ہوں -"

پریم زبان ہلائے بغیر کمرے سے باہر ہوگیا -

پریم کے چلے جانے کے راحت صاحب نے ایک دفعہ پھر تصویر اٹھائی - اور پھر رکھتے ہوئے اُن کی زبان سے نکل ہی گیا "واقعی عمدہ چیز ہے" پھر میز پر رکھی ہوئی گھنٹی پر انگلی رکھ دی -

چپڑاسی اندر داخل ہوکر باادب کھڑا ہوگیا — جاؤ ہاف ٹون کمپنی کے مینجر کو بُلالاؤ — مگر جلدی"

چپڑاسی واپس چلا گیا - راحت صاحب پھر اپنے خیالوں میں غرق ہوگئے - اُن کی نگاہیں - تصویر کے ہر ایک حصہ پر رقص کر رہی تھیں - ایک دماغ تھا - اور ہزاروں خیالوں کا ہجوم -

اتنے میں کرشنا کمپنی کے مینجر نے کمرے میں داخل ہو کر

خیالات کا تانتا توڑ دیا۔ ایڈیٹر نے تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

"اس کا بلاک تین دن میں تیار کر دیں۔ تین چار دن چھپنے میں لگ جائیں گے۔ آج بیس تاریخ ہے۔ اور ہمارا سالانہ نمبر تیس تاریخ کو شائع ہو جائے گا"

"آپ آج ہی کاغذ بھیج دیں۔ اٹھائیس ۲۸ تاریخ کو چھپی ہوئی تصویر آپ کے آفس میں پہنچ جائے گی۔

"بہت بہتر"

"کرشنا ہاف ٹون کمپنی" کے مینجر نے تصویر اٹھائی اور آداب کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

بہار ادب کا سالانہ نمبر نکلا۔ دھوم مچ گئی۔ باقی تمام ادبی رسالوں سے سبقت لے گیا۔ جس نے دیکھا محو حیرت ہوا۔ افسانے تھے تو وہ چوٹی کے انشا پردازوں کے۔ تصاویر تھیں تو وہ نامور مصوروں کی۔ مگر جو تصویر سب سے اول لگائی گئی تھی۔ اُسے جو دیکھتا دل پکڑ کر رہ جاتا۔ تصویر کے سامنے تصویر ہو جاتا۔ بہار ادب کے چار صد نئے خریدار کھڑے ہو گئے۔ باقی پرچہ ہاتھوں ہاتھ فروخت ہونے لگا۔

دن گذر گئے آج پہلی تاریخ تھی۔ ہریم اپنی مختصر کٹیا سے نکلا اور شہر کی جانب روانہ ہوا۔ چاندنی چوک سے

گذر رہا تھا۔ کہ اچانک اُس کی نظر بہار ادب پر پڑی۔ وہ ایک سٹال پر ٹھہر گیا۔ سالانہ نمبر تھا۔ حجم کافی تھا۔ تصاویر کئی مگر سب سے اوّل تصویر پر نظر پڑھتے ہی اُس کی روح کانپ اُٹھی۔ دماغ میں ایک خیال نے چٹکی لی اور وہ دیوانہ وار بہار ادب کے دفتر کی طرف بھاگا۔ سالنامہ کی اوّل تصویر اُس کے دماغ کا جدید اختراع تھا۔

پریم کا جوش ناقابلِ برداشت تھا۔ مگر پھر بھی اُس نے ظاہر نہ ہونے دیا۔ بلکہ حسب معمول نہایت آہستگی سے کمرے میں داخل ہوُا ۔۔۔ ایڈیٹر صاحب نے خلاف معمول کہا۔

"پریم جی آئیے۔ تشریف رکھیے"

مگر پریم جوش میں اندھا ہو رہا تھا۔ کھڑے کھڑے ہی کہنے لگا۔ میرے خیال میں آپ نے تصویر کا فیصلہ کر لیا ہوگا۔

"ہاں ابھی ہے۔ آپ اپنی اجرت لے جائیں۔" یہ کہتے کہتے ایڈیٹر نے میز پر پڑی ہوئی چک بک اُٹھائی اور بیس روپے کا چک کاٹ کر پریم کی طرف بڑھا دیا۔

پریم نے چک دیکھا تو اندر ہی اندر جل بھُن کباب ہو گیا ایڈیٹر صاحب بھانپ گئے اور بولے

"کیوں کیا سوچتے ہو؟ تمہاری تصویر آئیندہ پرچہ میں شائع

کرنے کا ارادہ ہے!"

"اجرت بہت کم ہے - میں پچاس روپے سے کم ہرگز نہیں لے سکتا۔ میرے کم ایک پانچ دن کی دماغ سوزی کا نتیجہ صرف ایک وہ تصویر ہے —— کیا انصاف دنیا سے غائب ہو چکا ہے۔ کیا مزدوروں کا گلا گھونٹنا ہی سرمایہ داروں کا شیوہ ہے۔

راحت صاحب ایسی جلی کٹی باتیں سُننے کے عادی نہ تھے۔ نہایت جوش سے تصویر نکال کر پریم کے آگے رکھ دی۔ اور کہا لے جاؤ ہمیں ایسی تصویر کی ضرورت نہیں - آئندہ اس کمرے میں قدم نہ رکھنا"۔

ان تمام باتوں نے آگ پر تیل کا کام کیا۔ پریم کا جوش بھڑک اٹھا۔ اُس نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"آپ تمام باتیں آدمیت سے بعید کر رہے ہیں۔ جھوٹ بولنا آپ ایسوں کا شیوہ نہیں - تصویر سالانہ نمبر میں شائع ہو چکی ہے۔ اور آپ کہتے ہیں آئندہ نمبر میں شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ اب اسے کون خریدے گا۔

پریم کی اس بات سے ایڈیٹر صاحب پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ ندامت سے سر جھک گیا۔ آنکھیں میز پر جا لگیں۔ مگر یکایک

ایک خیال آیا۔ اب آنکھوں میں پھر وہ غصہ اور وہی جوش تھا۔ سالانہ نمبر نکالتے ہوئے بولے۔

"یہ دوسرے مصوّر کی چیز ہے۔ دیکھو اس میں میری تصویر بھی ساتھ ہی دکھائی گئی ہے۔ مگر تمہاری تصویر میں یہ جدّت نہیں"

پریم نے دیکھا۔ واقعی ایک کونے کو کاٹ کر ایڈیٹر کی ایک رنگی تصویر لگائی گئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بلاک تیار ہوجانے کے بعد اُسے کاٹ کر وہ تصویر لگائی گئی ہے۔ مگر باقی تخیل تمام پریم کا تھا۔

پریم نے کہا"

"تمام تصویر میرے دماغ کا خیال ہے۔ یہ تصویر بعد میں لگائی گئی ہے"

"تو کیا میں جھوٹ بولتا ہوں؟"

"ہاں — بالکل — سفید"

ایڈیٹر نے آنکھیں لال کرتے ہوئے کہا "کمرے سے باہر نکل جاؤ۔"

پریم نے میز سے تصویر اٹھائی اور اُس کے ٹکڑے کر کے میز پر پھینک دیا۔ پھر ایک بار ایڈیٹر کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال اور کمرے سے باہر ہوگیا!

تیسرے دن ایک گڈریئے کی اطلاع پر پولیس نے آکر دیکھا کہ پھلواڑی کے پودے سر جھکائے کھڑے تھے۔ کٹیا پر حسرت برس رہی تھی۔ کلاکار کے دماغ کے تمام نایاب تخیل ردی حالت میں زمین بوس تھے۔ پریم کا چہرہ زہر کے اثر سے نیلا پڑ گیا تھا۔ ڈاکٹر کی زبان سے معلوم ہوا کہ طائر کو پرواز کیے ہوئے چوبیس گھنٹے ہو چکے ہیں!

راحت صاحب نے یہ سب سنا تو سر پکڑ کر رہ گئے۔ انہیں اس انجام کی مطلق خبر نہ تھی۔ انہوں نے بہار ادب میں پریم کی فوٹو شائع کی۔ آرٹیکل لکھے۔ اس کی سوانح حیات قلم بند کی۔ پبلک کو بتا دیا کہ پریم بہترین مصوّر تھا۔ سالانہ نمبر والی تصویر فروری کے پرچہ میں پھر شائع کی گئی۔ اور اس کے نیچے لکھا گیا۔

"پریم کا آخری تخیل"

اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

کرشمۂ حُسن

(۱)

قیدی نے پہرے دار کے منہ پر اپنے جسم کی پوری قوت سے تھپڑ جمایا اور بولا "بس یہیں پڑے رہو"۔

پہرے دار تھپڑ کی تاب نہ لاسکا۔ اور چشم زدن میں زمین پر آرہا۔ اب کامیاب قیدی کے چہرے پر خوشی رقص کررہی تھی۔ اُس نے پہرے دار کا بھاری جسم کھینچ کر اندر کرلیا۔ اور اپنے کپڑے اُس سے تبدیل کر لیے۔

اب وہ قیدی نہیں بلکہ سپاہی تھا۔

نقلی سپاہی رات کی خوفناک تاریکی کو چیرتا ہُوا لمحہ بہ لمحہ آگے بڑھنے لگا۔ کیونکہ اُس کے تمام ساتھی خوابِ غفلت میں مدہوش تھے۔ اس لئے کسی کو

مطلق خبر نہ ہوئی - کہ ساتھ والے کمرے میں کیا ظہور میں میں آیا ہے -

قیدی جلدی ہی سمندر کے ساحل پر جا پہنچا - جہاں ایک کشتی تیار تھی - جس پر ایک شخص اپنا سراپا سیاہ لبادے میں چھپائے کسی کا منتظر بیٹھا تھا - سپاہی کے قدم رکھتے ہی کشتی بجلی کی سی تیزی سے پانی کی خوفناک لہروں کو کاٹتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی -

(۲)

"پیارے یہ چند دن کی جدائی میرے لئے ....

کہتے کہتے شوشیلا کا گلا بھر آیا اور نازک رخساروں پر آنسوؤں کے چند گرم قطرے ڈھلک آئے - گوپال شوشیلا کی آنکھوں میں آنسو نہ دیکھ سکا اور بے قرار ہو کر بولا :

"پیاری شیل تمہاری پُرنم آنکھیں میرے جگر پر چھری کا کام کرتی ہیں - اس کے ساتھ ہی جیب سے رومال نکال کر شوشیلا کی آب گوں آنکھیں پونچھ دیں -

شوشیلا ! - پران ناتھ کیا آپ کو میرا خیال دو دن میں ہی بھول گیا تھا ! مگر نہیں ---- !

گوپال ! - شیل آج تم کیسی باتیں کر رہی ہو -

صرف ایک دن کی جدائی کا اس قدر صدمہ - مجھے یہ
خواب میں بھی خیال نہ تھا -

شوشیلا :" پیارے جس وقت سوہن کو اپنے جرم
کی پاداش میں کالے پانی کی سزا ہوئی - اور آپ نے کہا -
اس کی مدد ضرور کرنی چاہیئے - نہیں تو یہ بچارا ایسی بھیانک
جگہ سے واپس نہ آسکے گا - میں اسی دن سے
سمجھ رہی تھی - کہ سوہن کی جگہ آپ کالے پانی جا
رہے ہیں -

گوپال :- مگر سوہن کی جگہ میں نے کس صفائی سے
لی تھی ؟"

شوشیلا :- چاہے کچھ بھی ہو مجھے ایسی باتیں اچھی
نہیں لگتیں -"

گوپال - یہ کیوں ؟

شوشیلا - اس لئے کہ آپ اپنی زندگی ایک ــــ !

گوپال - مگر اس پر بھی ــــ !

شوشیلا :- میں سب کچھ جانتی ہوں - پیارے اس پر
بھی آپ کو سینکڑوں جرائم پیشہ لوگ استاد کے پوتر نام سے
پکارتے ہیں - ہزاروں عقلمند جاسوس آپ کی دانائی

اور ہتھکنڈوں کے آگے ناک رگڑتے ہیں ۔ مگر پھر بھی آپ
اُن کی نظروں میں محض ایک ڈاکو کی حیثیت سے زیادہ وقعت
نہیں رکھتے ۔ جب کبھی موقعہ ملا وہ آپ کو ماکھن کے
بال کی طرح نکال کر پھینک دیں گے !!
اب کشتی کنارے پر پہنچ چکی تھی ۔ اس لئے گفتگو کا
سلسلہ بھی یہیں ختم ہو گیا ۔

(۳)

زمین دوز تہ خانہ کی سیڑھیاں اترتے ہوئے گوپال نے
کہا :۔ شیل تمہارے خیال میں آج کا دن اچھا ہے ۔
شو شیلا :۔ بہت ہی اچھا ہے ۔ پیارے ! بھلا کام
کرنے کے لئے سارے دن ہی اچھے ہوا کرتے ہیں ۔ کسی
نے سچ کہا ہے ؎

تخم نیکی رائیگاں جانا نہیں
کر بھلا تیرا بھلا ہو جائیگا

گوپال :۔ شیل تم دھنیہ ہو ...... اے حسن تجھے
پرنام !
شو شیلا ۔ وجہ
گوپال ۔ اس لئے کہ تم نے میری زہریلی زندگی کو آبِ حیات

کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے۔ کیا یہ خواب میں بھی خیال ہو سکتا تھا کہ اس قدر عجیب وغریب اور عظیم الشان انقلاب پیدا ہوگا۔ اور اپنا سب کچھ قربان کر دونگا۔ تمہارے بغیر ایسی کوئی ہستی نہیں تھی۔ جو مجھے میرے اس گندے ارادے سے باز رکھتی۔

شوشیلا:- اچھا جانے دیں۔ پھر کبھی ایسی باتیں ہوں گی"

دوسرے دن ہی شہر میں ایک دفتر گوپال اینڈ کو کے نام سے کھول دیا گیا۔ جو چند ہی دنوں میں ترقی کے شکھر پر جا پہنچا۔

عورت ۔ مرد

عورت کی زبان تین انچ سے زیادہ لمبی نہیں ہوتی ۔ مگر بدمزاجی پر چھ فٹ لمبے مرد کو نیچا دکھا سکتی ہے ۔

مرد ارادے کا پکا ۔ محنتی ۔ چالاک اور مستانہ ہوتا ہے ۔ عورت متحمل مزاج امن پسند ۔ محبت کی دلدادہ اور ہر حالت میں ایک جیسی رہتی ہے ۔ وجہ یہی ہے کہ مرد اعلیٰ ڈاکٹر اور عورت عمدہ نرس بن سکتی ہے ۔

عورت کا دل اٹل مگر خیالات محدود ہوتے ہیں ۔ مرد کسی شے کو پسند یا ناپسند کر سکتا ہے ۔ مگر عورت اپنے فیصلہ پر ہمیشہ قائم رہتی ہے ۔

عورت سفید جھوٹ شاذونادر بولتی ہے ۔ کیونکہ زبان ہلانے سے پیشتر وہ ہر ایک بات کو تول لیتی ہے ۔ وہ اپنے جرم قبول کرنے سے گریز نہیں کرتی ۔ مگر اپنی غلطی کا اعتراف بہت کم کرتی ہے ۔

مرد ہر وقت جلد بازی چاہتا ہے لیکن عورت ہر قدم پر آرام سے کام لیتی مرد کم مگر اکثر محبت کا دم بھرتا ہے ۔ عورت بہت زیادہ محبت کرتی ہے ۔ لیکن صرف ایک بار ۔ عورت محبت کی قربان گاہ پر خود کو فنا کر دیتی ہے ۔ برخلاف اس کے مرد نفسانی خواہش کے زیر اثر ضمیر کیطرح اس عورت کو بھی ٹھکرا دیتا ہے ۔ جس پر جان و دل سے فدا ہو ۔

عورت جب تک محبت کرتی ہے ۔ لگاتار کرتی ہے ۔ مگر مرد کے محبت کرنیکا موقع ہوا کرتا ہے ۔

کرنی کا پھل

(۱)

برج لعل امرتسر کے مشہور جواہری تھے - لاکھوں کا کاروبار تھا - گورنمنٹ کی طرف سے رائے صاحب کا خطاب عطا تھا - اُن کی عمر کا کافی حصہ بے اولادی میں کٹا - مگر اس آخری وقت میں پرماتما نے انہیں ایک پسر دیا تھا - جو اُن کی تمام عمر کی کمائی تھی -

کوشلیا رائے بہادر مول راج کی لڑکی تھی - اور برج لعل کی دھرم پتی - وہ آخری عمر میں لڑکے کا مُنہ دیکھ کر پھولی نہ سمائی - اس کا دل خوشی سے نہال ہو گیا - جیسے کسی غریب کو لاکھوں کی دولت مل گئی ہو - کسان آسمان کی طرف ہاتھ پھیلائے ہوئے ابر کے ٹکڑوں کو دیکھ رہا تھا - مگر اُس کی مراد پوری

نہ ہوتی تھی - آج ایشور کو اُس کی حالت پر جیسے رحم آگیا ہو۔ کوشلیا کی بھی یہی حالت تھی - اور یہی وجہ تھی - کہ وہ رامیش کو حد سے زیادہ پیار کرتی تھی - رامیش کی زبان سے نکلے ہوئے لفظ اُس کے لئے قانونِ قدرت کی طرح اٹل ہو جاتے تھے - اسی وجہ سے رامیش اس چھوٹی سی عمر میں شاہ خرچ ہو چکا تھا -

وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

رامیش ابھی دس سال کا ہی تھا - کہ اُس کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ گیا - بے چاری کوشلیا پر رنج والم کے بادل چھا گئے - وہ شدت غم سے نڈھال ہو گئی - مگر پرماتما کے کاموں میں کسی کا ہاتھ نہیں - اُس کے نظام کو درہم برہم کرنا انسانی عقل کے بعید ہے -

رامیش! باپ کی موت سے بے چین ہو گیا - اُس کی دل سوز آہوں نے لوگوں کے دلوں پر گہرا اثر کیا - کوئی کہتا ابھی بچہ ہے - اُس نے باپ کا ابھی دیکھا ہی کیا ہے - کوئی کہتا بھگوان کا دیا سب کچھ ہے - اُسے کس بات کی پرواہ ہے - اگر باپ نہیں رہا -

تو نہ سہی — وہی رامیش جو کل اپنی ہر بات پر مچل پڑتا تھا۔ آج بے یار و مددگار رہ گیا۔

(۲)

رامیش کے پتا کو اِس جہان سے رخصت ہوئے پانچ سال ہو گئے۔ اب رامیش نے اپنی پندرھویں سالگرہ میں قدم رکھا۔

رامیش — وہی رامیش جو کبھی فرشتہ تھا۔ آج درندے کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ ادھر برج لعل نے آنکھیں بند کیں۔ اِدھر اس کے بدبخت دوستوں نے اُس کو گھیر لیا۔ گو اُس وقت رامیش کی عمر کوئی زیادہ نہ تھی۔ مگر پھر بھی ورغلانے کے لئے کافی سے زیادہ تھی۔

جو رامیش اپنی ماں کے سامنے آنکھیں اُونچی نہ کر سکتا تھا۔ آج وہی جلی کٹی باتوں سے اس کا دل چھلنی کر رہا تھا۔ لیکن بیچاری کوشلیا اُف تک نہ کرتی۔ مگر اندر ہی اندر یہ تمام باتیں اس کو کھائے جاتی تھیں۔ آخر ایک دن وہ بھی پرلوک سدھار گئی۔ رامیش کی راہ میں ایک روڑہ تھا۔ وہ بھی

قدرت نے اُٹھا لیا۔ اب وہ آزاد تھا —— بالکل آزاد۔

اب اُس کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہُوا۔ اُس نے دوکان پر جانا بالکل ترک کر دیا۔ نوکر خود ہی دوکان کھولتے اور بند کر کے چابیاں گھر دے آتے۔ رامیش ایک دو منٹ کیلئے دوکان پر جاتا۔ اور واپس آ جاتا۔ اُس کو دوستوں سے فرصت ہی کہاں تھی۔ شام کو منیم گھر آکر تمام حساب دیتا۔ اور رامیش شراب کے نشے میں دین و دنیا سے بدمست سر ہلا کر اُس کی تسلی کر دیتا۔

یہ حالت کہاں تک رہ سکتی تھی۔ دولت کی دیوی غالباً اس کے بزرگوں کی بد دعا سے ناراض ہو چکی تھی۔ نوکروں نے مل کر آہستہ آہستہ مال ہضم کرنا شروع کر دیا۔ کوشلیا کے مرنے کے دو سال بعد ہی رامیش کو دیوالے کی درخواست دینی پڑی۔ جو ایک آدھ مکان تھا۔ اُس کو بیچ کر نقد روپیہ اپنے پاس رکھا۔ مگر وہ بھی ایک سال کے قلیل عرصے میں شراب کی بوتلوں میں بہ گیا۔ برج لعل کی تمام جائداد تباہ ہو گئی رہا لیکن

مکان پہلے رہن ہوُا آخر بک گیا

رامیش کی بڑی حالت دیکھ کر اُس کے یار دوست بھی رفوچکر ہو گئے۔ جن پر رامیش کو مکمل یقین تھا کہ موت کے بعد بھی میرا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ اُن میں سے کوئی بھی نظر نہ آتا تھا۔ اُسے اب معلوم ہوُا کہ میں خوفناک غار کی طرف جارہا ہوں۔ جس سے بچ کر نکل آنا دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ چڑیا ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ اب صرف اُس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ وہی رامیش جس کے سامنے نوکر سرخم حکم کے منتظر نظر آتے تھے۔ آج روٹی کے ٹکڑے تک کا محتاج ہو گیا کار پردازاں قسمت جب گلیم بخت سیاہ بنتے ہیں۔ تو کوئی لاکھ زمزم اور کوثر سے صاف کرے۔ کبھی سفید نہیں ہو سکتی۔

(۳)

قادر دس نمبر کا بدمعاش تھا۔ امیر گھرانوں کے لڑکوں کو ورغلا کر اُن کی دولت ہضم کرنا اُس کا کام تھا۔ یہی کام اُس نے رامیش سے کیا!

جب رامیش کسی کام کا نہ رہا تو قادر کے سامنے سرنگوں ہُوا - کسی طرح میری جان بچاؤ - نہیں تو میں فاقوں کی وجہ سے جان توڑ دوں گا - قادر نے زمانے میں کئی رنگ دیکھے تھے - سینکڑوں نوجوانوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا - اس لئے اُسے رامیش کے دل کا حال معلوم کرنے میں دیر نہ لگی -

"تم میرے مکان میں آنے جانے والوں کو تمباکو وغیرہ پلا دیا کرو - میں تم کو روٹی کھلا دیا کروں گا اگر منظور ہے تو ــ"

"مگر مجھ سے یہ ذلیل کام انجام نہ ہو گا - جو کبھی میرے ٹکڑوں پر گذارہ کرتے تھے - میں اُن کی کس طرح خدمت کر سکوں گا ؟ -

"ہاں ایک اور کام ہے - اگر منظور ہو تو تمہیں کسی دوسری جگہ پہنچا سکتا ہوں"

"یعنی ــ"

"مسلمان بننا قبول کرو - اس حالت میں کسی جگہ نوکری دلا دوں گا - پھر تم اپنی باقی زندگی آرام سے گذار سکو گے"

رامیش کا سر چکرانے لگا۔ اُس کے دل میں خیال پیدا ہُوا میں کس انجام پر پہنچا ہوں۔ کسے معلوم تھا۔ رائے صاحب برج لال کے لڑکے کا یہ حشر ہو گا۔ قادر کے الفاظ رامیش کے جگر کو چیر کر نکل گئے۔

مگر کیا کر سکتا تھا۔ چپ چاپ اُس کے مکان سے باہر نکل گیا۔ مرکر بھی سانپ کی دہشت نہ گئی۔

مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ جدو جہد کے بلا خیز سمندر میں رامیش نے بساط سے بڑھ کر ہاتھ پاؤں مارے۔ مگر گرداب ناکامی نے اُسے اُبھرنے نہ دیا۔ آدمی کا پیٹ سب کچھ کروا سکتا ہے۔ وہی رامیش جو کبھی عیش و طرب کی مجلسوں میں شریک ہُوا کرتا تھا۔ آج نانِ جویں تک کا محتاج بازاروں میں چکر کاٹ رہا تھا۔ مگر اب اُس شکستہ حال پر کوئی رحم کھانے والا بھی نہ تھا۔ پیٹ کی آگ بڑوں بڑوں کے حوصلے پست کر دیتی ہے۔ تیسرے دن وہ پھر قادر کے مکان پر پہنچا اور بولا۔

"مجھے مسلمان بننا منظور ہے"

اُسی دن مسجد میں رامیش کی چوٹی اور جینوں کا خون کر

دیا گیا۔ اب رامیش - رامیش نہیں۔ بلکہ یعقوب تھا۔
قادر نے اسی وقت اپنے ایک شاگرد کو بلا کر کہا۔ کہ
اسے کوچوانی کا کام اچھی طرح سکھا دو۔ اور جب ماہر
ہو جائے اسے بھی ایک ٹانگہ دے دینا۔

ایشور کی مایا عجیب ہے۔ محلوں میں رہنے والا۔
شہزادوں کی سی زندگی بسر کرنے والا رامیش۔ یعقوب
بنا۔ یہاں تک قناعت نہ کی۔ گھوڑوں کی لید صاف
کر رہا ہے۔ سچ ہے۔ بُرے کاموں کا نتیجہ بُرا ہوتا
ہے۔ وہ جن لوگوں کو اپنا دوست سمجھتا تھا۔ وہ درحقیقت
اس کے دشمن نکلے۔ یہ لوگ بظاہر گو سفید سلیم تھے۔
مگر باطن میں خونخوار بھیڑیے۔

یعقوب اب صرف یعقوب ہی نہیں بلکہ کوچوان کا
خطاب حاصل کر چکا ہے۔ اسٹیشن سے شہر اور شہر
سے اسٹیشن تک۔ سواریاں پہنچانا اس کا کام تھا۔ ہر
انگریزی کی پہلی تاریخ کو قادر سے بیس روپے مل
جاتے ہیں۔ شراب کا دور پھر شروع ہو چکا ہے۔
بے شک وہ ماضی کو بالکل بھول چکا ہے۔
مگر آج کل دورِ شراب میں پھر بھی دھندلی سی

یاد آ ہی جاتی ہے - سانپ گذر گیا تھا - مگر لکیر باقی تھی - اب رامیش مفلس و نادار تھا - مگر شراب اور قمار بازی کا شوق جو اُس کا روح رواں تھا - نہ گیا - اور نہ گیا -

(۴)

سوہن لالہ بنواری لعل کا لڑکا تھا - اُس کے دو بڑے بھائی اور ایک بہن تھی - بنواری لعل کا کراچی میں کپڑے کا کاروبار تھا -

بنواری لعل کے بال سفید ہو چکے تھے - مگر پھر بھی وہ حال کسے نوجوانوں سے کم نہ تھے - سوہن کی منگنی کے لئے کئی لوگ آئے - مگر بنواری لعل یہ کہہ کر ٹال دیا کرتا کہ لڑکا میٹرک پاس کر لے پھر دیکھا جائیگا -

بالآخر سوہن میٹرک میں کامیاب ہو گیا - اب بنواری لعل کو بہانہ بنانا مشکل ہو گیا - اس لئے سوہن کی شادی چرنجی لعل کی اکلوتی لڑکی سے ہو گئی -

چرنجی لعل امرتسر میں سونے کا کاروبار کرتے تھے - کام اچھا تھا - کافی جائداد تھی -

سوہن پہلی بار اپنی بیوی کو لینے امرتسر آیا - پہلے

پہلی سسرال میں جتنی عزت جتنا مان ہوتا ہے۔ یہ شادی شدہ اصحاب بخوبی جانتے ہیں۔ سوہن کو مجبوراً ایک ہفتہ امرتسر رہنا پڑا۔ آخر آٹھویں دن وہ کراچی کی طرف روانہ ہونے کے لئے اسٹیشن پر آیا۔ بیوی کو تو ایک زنانہ کمپارٹمنٹ میں بٹھا دیا۔ اور آپ دوسرے ڈبے میں جا بیٹھا۔ گاڑی دو گھنٹہ لیٹ تھی۔ یہاں دیر تک ٹھہرنے کی وجہ سے بملا کو پیاس نے بہت تنگ کیا۔ ایک شوہر سے بالکل ناآشنا۔ دوسرے حیا۔ دو باتیں تھیں۔ جو پیاس کو اور بھی تیز کر رہی تھیں۔ اور نہ ہی سوہن بملا کو دوبارہ بملا کو دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ شدت پیاس سے بملا حیران ہو رہی تھی۔ سامنے نل تھا۔ مگر وہاں تک پہنچنا اُس کے لئے ناممکن ہو رہا تھا۔ شہر کی لڑکیاں لاکھ باحیا ہوں مگر پھر بھی آزاد ہوتی ہیں۔ بملا سے نہ رہا گیا۔ وہ اُٹھی اور نل کی طرف روانہ ہوئی ابھی نصف راستہ بھی طے نہ کیا تھا۔ کہ انجن نے آخری وسل دی۔ اور روانہ ہو پڑا۔ اس سے پہلے کہ بملا پھر واپس ہوتی۔ گاڑی تیز

ہو چکی تھی ۔ وہ دیکھتی رہ گئی ۔ وہ اتنی قریب ہوتے ہوئے بھی کتنی دور تھی ۔ اب ہو ہی کیا سکتا تھا ۔ آخر بلیٹ فارم سے باہر نکلی تو اس کی نگاہ یعقوب پر پڑی ۔ جو اپنا تانگہ لئے دروازے کے سامنے کھڑا تھا ۔

"تانگہ خالی ہے؟"

"ہاں"

بملا تانگے میں بیٹھ گئی اور اُسے کچہری روڈ پر چلنے کے لئے کہا ۔ تانگہ ہوا سے باتیں کرنے لگا ۔

شام کا وقت تھا ۔ عالم پر تاریکی اپنا تسلط جما رہی تھی ۔ یعقوب نے ایک بار مڑ کر بملا کی طرف دیکھا ۔ وہ زیورات سے لدی ہوئی تھی ۔ اُسے اس حالت میں دیکھ کر یعقوب کے منہ میں پانی بھر آیا ۔ ماضی کی تمام عیش و نشاط کی باتیں ایک ایک کرکے سامنے آنے لگیں ۔ تھوڑی دیر کے لئے دل میں ایک خیال نے چٹکی لی ۔ اور پھر یک دم ہی وہ خیال مضبوط ہو گیا ۔

اب تانگہ بجائے کچہری کی سڑک کے رام باغ کی سڑک

پر دوڑ رہا تھا۔ بملا سوہن کے خیال میں محو تھی۔ اُس کا تخیل ہوائی گھوڑے پر سوار نا معلوم کہاں سے کہاں پہنچ گیا تھا۔

وہ دل سے باتیں کر رہی تھی۔" کیا وہ اتنے ہی لاپرواہ واقع ہوئے ہیں۔ کہ انہیں خبر تک نہ ہوئی۔ کیا میں امرتسر میں ہی رہ گئی ہوں"۔ بملا کے تخیل نے ابھی یہاں تک ہی پرواز کیا تھا۔ کہ ٹانگہ رُکا۔ بملا چونک پڑی اُسے اب معلوم ہوُا کہ میرے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ میں اپنے خیالوں میں اتنی کھوہ گئی تھی۔ کہ پتہ تک نہ لگا ٹانگہ کس طرف جا رہا ہے"!

بملا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ سر چکرانے لگا۔ جسم تھرا اُٹھا۔ ٹانگہ ایک ویران جگہ میں کھڑا تھا۔ چاروں طرف موت سی خاموشی چھا رہی تھی

یعقوب نے کرخت مگر مدھم آواز میں کہا " اگر جان عزیز ہے۔ تو تمام زیور اُتار کر رکھ دو"!

بملا نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا۔ یعقوب کے ہاتھ میں سات انچ لمبا چاقو چمک رہا تھا۔ وہ دہل گئی۔ ایک دفعہ تو اس کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ مرنا ایک بار ہے۔

مرنے سے پہلے اسے اپنے جسم کو ہاتھ تک نہ لگانے دوں گی - مگر موت کا خیال آتے ہی اس کا کلیجہ کانپا پھر کچھ سوچ کر - ایک ایک کر کے اپنے جسم سے تمام زیور اتار کر یعقوب کے آگے رکھ دیا - یعقوب نے اٹھا کر انہیں اپنی اندرونی جیب میں رکھا - اور بملا کو تانگہ سے نیچے اتار خود جانے کے لئے تیار ہو گیا.

بملا نے نہایت عاجزی سے کہا -

مجھے کہاں چھوڑے جاتے ہو - کچہری روڈ تک تو پہنچا دو -

یعقوب نے جیسے سنا ہی نہیں - گھوڑے کو چابک رسید کی اور چل پڑا - مگر چند قدم ہی گیا تھا - کہ ٹھہر گیا - یکا یک خدا معلوم اس کے دل میں کیا خیال پیدا ہوا کہ واپس ہو پڑا - اور بملا سے مخاطب ہو کر بولا -

"تمہارا ابھی کام تمام کئے جاتا ہوں - شائد تم ہی میری اجل کی صورت اختیار نہ کر لو - اگر تو زندہ بچ گئی - تو میں دنیا میں کسی کام کا نہ رہونگا"

پھر اپنے سر کی پگڑی اتار کر ہاتھ پاؤں باندھے اور چاقو اوپر اٹھایا. مگر بملا کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر اُس

کا دل لرز اٹھا - بدن میں برقی لہر دوڑ گئی - ہاتھ کانپے - پاؤں ڈگمگائے - چاقو ایک پانی کے گڑھے میں جا گرا - اُس کے دل میں نیکی اور بدی میں جنگ ہو رہی تھی - نیکی اس گناہِ عظیم سے روکتی تھی - مگر بدی کہتی تھی - اگر یہ زندہ بچ گئی - تو تم صبح پھانسی کے تختے پر ہو گے - آخر بدی نیکی پر غالب آئی - یعقوب چاقو نکالنے کیلئے پانی میں داخل ہُوا مگر اپنے ناپاک ارادے میں کامیاب نہ ہو سکا - کیونکہ پانی میں سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا - جس نے یعقوب کے پاؤں میں خوب کس کر گرہ باندھ لی - جس کی وجہ سے یعقوب کو پانی سے نکلنا دشوار ہو گیا - کسی نے سچ کہا ہے - مارنے والے سے بچانے والا زبردست ہے -

ایک طرف تو یعقوب کو سانپ نے پکڑ رکھا ہے -

اور دوسری طرف بملا پگڈی سے جکڑی پڑی ہے -

جاکو راکھے سائیاں - مار نہ سکے کو

بال نہ بیکا کر سکے - جا جگ بیری ہو

لالہ دھنی رام عارف تھے - روزانہ رام تلائی پر جا کر

اشنان کر کے سندھیا پوجا کرنا ان کا معمول تھا۔ شہر والے اُن عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ اپنے روزانہ پروگرام کے مطابق آج بھی رام تلائی کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر ابھی گھی منڈی کے دروازے سے باہر چند قدم ہی گئے تھے۔ کہ کسی کے رونے کی آواز سے ٹھہر گئے۔ انہوں نے آواز پر کان دیئے۔ تو ساتھ کے درختوں میں سے آواز آ رہی تھی۔ وہ بڑھے۔ تو دیکھا کہ ایک نو عمر حسینہ جکڑی ہوئی درخت کے نیچے پڑی تھی۔ سامنے طرف ایک گڑھا تھا۔ جس میں بارش کا پانی پڑ کر جمع ہو گیا تھا۔ اُس میں ایک آدمی کھڑا نظر آیا۔ وہ حیران تھے کیا معاملہ ہے۔ اُن کے دماغ نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آگے بڑھے۔ اور دوشیزہ سے دریافت کیا۔

"دیوی کیا بات ہے! تم اس حالت میں کیوں ہو؟"

"آپ میرے ہاتھ پاؤں کھول دیں۔ پھر تمام واقع سناؤنگی۔"

دھنی رام نے بملا کو آزاد کر دیا۔ اُس نے تمام داستان

شروع سے لے کر آخر تک گوش گذار کر دی۔ اتنے میں اور آدمی بھی اکٹھے ہو گئے۔ کیونکہ صبح ہو چکی تھی۔ اور لوگ آنے جانے شروع ہو گئے تھے۔ آہستہ آہستہ یہ خبر تمام شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دھنی رام نے جاکر پولیس میں اطلاع دی۔ انسپکٹر پولیس چند سپاہیوں کے ساتھ آ پہنچے۔ بملا کا بھائی بھی پہنچ گیا۔ آخر یعقوب کو پانی سے باہر نکالا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ اُس کے پاؤں سانپ نے جکڑ رکھے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھا تو سانپ مردہ تھا۔ لوگ حیران رہ گئے۔ قدرت کی ہر بات میں راز ہے۔

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد یعقوب کو عمر کالے پانی کی سزا ہوئی۔

۵۰ فیصدی سچا واقعہ

سوسائٹی کی بھینٹ

(۱)

کملا کے ایام لڑکپن کی شوخی و معصومیت ختم ہو چکی تھی — اُس کی جگہ پُرجوش اور مسرت خیز شباب برساتی نالے کی مانند ٹھاٹھیں مار رہا تھا — وہ حسین تھی — ماہ کامل کی طرح — اس کے سینے میں اُمنگوں کا دریا موجزن تھا۔

مگر وہ منزل پر پہنچا ہُوا۔ دور دراز کا سفر طے کر کے — تھکا ماندہ — ایک مسافر تھا۔ جس کا ہر عضو ناکارہ ہو چکا تھا — اس کی زندگی چراغ سحری کی مانند تھی۔

ایک کی زندگی کی صبح دلکش تھی۔ اور تمناؤں کا آفتاب پورے جوش سے طلوع ہو رہا تھا۔ مگر دوسرے

کی زندگی کی قیامت خیز شام ـــــ جس کی ظلمت میں جسم کی بوسیدگی کے ساتھ آرزوئیں بھی غرق ہو رہی تھیں۔

اُف! دونوں میں کتنا اختلاف تھا ـــ!

کملا کے باپ کی آنکھیں تو دولت کی چمک سے اندھی ہو گئی تھیں۔ لیکن سوسائٹی! ـــ اس نے بھی سب کچھ دیکھا تھا۔ سمجھا۔ مگر پھر بھی کملا کو اس لقمۂ اجل کی قسمت کے ساتھ وابستہ ہونے دیا۔

صبح دلکش شبِ دیجور سے بغل گیر ہو گئی۔ عالم نے چپ چاپ دیکھا۔ لب تک وا نہ کئے

(۲)

اگلے دن

شام کا وقت تھا۔ کملا دریا کے کنارے بحرِ خیالات میں متغرق بیٹھی تھی۔ پشت پر گیسوئے خمدار ہوا کے مشک بار جھونکوں سے لہرا رہے تھے ـــــ چوٹ کھائے ہوئے ناگوں کی طرح۔

وہ غائب میں جھانکنے کی ناکام سعی کر رہی تھی۔ اُس کا دل کسی نامعلوم خطرے کو محسوس کر کے دھڑک رہا تھا۔ وہ اپنے دل کی حرکت کے ساتھ ساتھ قیامت کی خوفناک گرج

سُن رہی تھی ۔ اس کی باطنی آنکھوں کے سامنے اپنا تاریک مستقبل نادم ہو رہا تھا ۔ اس کی اس محویت کو "کملا" کی آواز نے توڑا ۔ کملا نے گھوم کر دیکھا ــــ مرلی تھا ــــ اس کا پیارا ــــ وہ اسی طرح بیٹھی رہی ۔ تعظیم کے لئے کھڑی بھی نہیں ہوئی ۔ کیوں کہ اس کا دل انتہائی گہرائیوں میں غرق ہو چکا تھا ۔

اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا "تم ہو! آؤ ــــ بیٹھو"

مُرلی اُس کے پہلو میں بیٹھ گیا ۔ اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہایت متانت سے کہنے لگا "کملا اکیلی کیا کر رہی ہو!"

مرلی کے اس سوال نے کملا کو گہری محویت کی دنیا سے نکال پھینکا ۔ وہ سنبھلی اور کہنے لگی "کچھ نہیں ــــ میں چند دنوں سے تنہا بیٹھنے میں راحت محسوس کرتی ہوں ۔ ــــ دیکھنا! کتنا دلفریب نظارہ ہے ۔ ...... ندی کی ترنم خیز لہریں ... پرندوں کی چہچہاہٹ ...... مغرب کی طرف آسمان پر دلکش سرخی .... جو شاہ خاور کی شان و عظمت کی یاد اس کے زوال میں بھی تازہ کر رہی ہے ۔

آہ ــــــ تم نہیں سن رہے تھے ۔۔۔ کیا؟

مرلی کی نگاہیں زمین کا جگر چیر کر کچھ دیکھنے میں محو تھیں ۔ اس کا دل و دماغ کچھ اور سوچ رہے تھے ۔ کان کملا کی آواز کو دماغ تک پہنچانے سے قاصر تھے ۔

مرلی کی اس محویت نے اس کے دل پر چرکا لگایا نا معلوم یہ کس دنیا میں تھے ۔ کملا نے دل میں کہا ۔ اس کا دل انتہائی دکھ سے بھر گیا ۔ اب اس کی حالت ایک ادیب کے مانند تھی ۔ جو اپنا شاہکار سنا رہا ہو ۔ مگر سننے والا اپنے ہی خیالات کی دنیا میں کھو گیا ہو ۔

مرلی ! مرلی ! ــــــ اس نے چلا کر کہا ۔ مرلی چونکا اور اس نے اپنی نظریں اس کی نظروں میں گاڑ دیں ۔

"میں جا رہی ہوں" اس کی آواز میں قدرتاً پہلے ایسی نرمی عود کر آئی ۔ وہ ہزار کوشش کرنے پر بھی چلا نہ سکی ۔

"وہاں ــــــ جس کی کوئی ابتدا نہیں ــــــ کوئی انتہا نہیں" اس نے ننھی ننھی سسکیاں بھرتے ہوئے کہا ۔

مرلی کچھ نہ سمجھا ۔ اس نے بہروں کی طرح اپنی ہی ہانکتے ہوئے عاجزی سے کہا "کملا!"

مگر کملا پر خود رفتگی کا عالم طاری تھا ۔ وہ شاعر کی طرح

بہترین الفاظ اور خیال کے موتی تصور کے سمندر سے جمع کر رہی تھی۔

"میں الوداع کہنے آیا ہوں"

"الوداع! نہیں مجھے بھی اپنے ہمراہ لے چلو"

"ایسا نہ کہو۔ کملا۔ تم اب بیگانی ہو۔ رنگین ماضی کو بھول جاؤ۔ اُس کے تصور تک کو آئینہ دل سے مٹا ڈالو۔ کملا! سچ تو یہ ہے۔ مجھے انسانوں سے کچھ نفرت ہو گئی ہے۔ میں اب وہاں جا رہا ہوں۔ جہاں انسان کا نام تک نہ پا سکوں جس جگہ موت کی سی خاموشی کا تسلط ہو"

"مجھے بھی وہاں لے چلو نا۔" کملا نے مرلی کے دامن کو جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ اس کی آنکھوں سے عاجزی کی جھلک جھلک رہی تھی۔

کملا! مجھے گناہ کا شریک کار نہ بناؤ۔ تم بیگانی ہو۔ کچھ سوچو تو سہی"۔

"نہیں۔ میں بیگانی نہیں ہوں۔ تمہاری تھی۔ تمہاری ہوں اور ہمیشہ تمہاری رہوں گی۔ میں اپنا سب کچھ کبھی کا تمہاری نظر کر چکی ہوں"۔

اس کے الفاظ میں نرمی تھی۔ لیکن اس کا لہجہ بتدریج

سخت ہو رہا تھا۔

"اگر اس ظالم سوسائٹی نے تمہاری امانت کسی دوسرے کے حوالے کر دی ہے تو تم سوسائٹی سے لڑو۔ اس کے دشمن بن جاؤ۔ اپنی چیز کے لئے۔ فقط اپنے حق کے لیے۔"

کملا کی آواز شدّت جوش سے کانپ رہی تھی۔

مرلی نے سناٹا سنا کر دیا۔ وہ آخری فیصلہ کر کے آیا تھا۔ اس واسطے اس نے کوئی ترمیم منظور نہ کی۔ وہ سمجھ رہا تھا۔ کہ اگر میں تھوڑی دیر اور یہاں ٹھہرا تو میرا ریت کی دیوار ثابت ہوگا۔

"الوداع" اس نے نظریں زمین پر گاڑتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں کمزوری تھی۔ لیکن دل چٹان کی مانند مضبوط۔ اس نے جواب تک کی پرواہ نہ کی۔ اور قدم اٹھا دیئے۔

کملا کے ہاتھ اس کو روکنے کیلئے اٹھے۔ لیکن کچھ سوچ کر وہیں کے وہیں رہ گئے۔ اس نے اس کو جانے دیا۔ کملا کی نظریں مرلی کی پیٹھ پر جم رہی تھیں۔ جو لحہ بہ لحہ دور . . . . . بہت دور ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ حرکت

کر رہے تھے۔ وہ زہر اُگل رہے تھے —— سوسائٹی کے خلاف نہیں بلکہ مُرلی کے خلاف۔ بُزدل اور بے رحم مُرلی کے خلاف۔ سوسائٹی اور اُس کے ہتھیاروں کے خلاف تو اس کے سینہ میں انتقام کی آگ دہک رہی تھی۔

(۳)

کمرے میں موت کی سی خاموشی مسلّط تھی۔ ماہ کامل کی سرد کرنیں جو کھُلی ہوئی کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوکر فرش پر رقصاں تھیں۔ اندھیرے گھر کو روشن کرنے میں اپنی تمام تر کوشش صرف کر رہی تھیں۔ لیکن ان کا نتیجہ اس کے منافی تھا۔ کملا —— گردن کے نیچے بازو رکھے نیم خوابی کی حالت میں پلنگ پر پڑی تھی۔ کھڑکی سے آئے ہوئے ہوا کے مسلسل جھونکوں نے ساڑھی کے آنچل کو اُس کے سینے سے اُتار پھینک دیا تھا۔ مار گیسو پریشان ہو رہے تھے۔ اس کے پُرکیف حسین چہرے پر چاندنی کی ایک کرن روشندان کے سوراخ سے نکل کر پڑ رہی تھی۔ جو اس کے چہرے کے تمام نقش نمایاں طور پر عریاں کر رہی تھی —— اُس کا چہرہ شگن آلود اور افسردہ تھا۔ کبھی کبھی اُس کے ہونٹ حرکت بھی کر

جگمگاتے ہوئے ستاروں میں بڑا حیران ہوں - تم عالم سے اتنے بلند ہیرے کی مانند آسمان میں کیا چیز ہو - جب سورج غروب ہو جاتا ہے - اور وہ کسی چیز پر اپنی کرنیں نہیں ڈال سکتا تب تم اپنی ننھی سی روشنی دکھاتے ہو اور تمام رات جھلمل جھلمل کرتے ہو۔

شب ظلمت میں مسافر تمہاری ہی چھوٹی سی چنگاری جیسی روشنی کا شکریہ ادا کرتے ہیں - اگر تم اس طرح نہ چمکتے تو وہ اپنا راستہ کسطرح تلاش کرتے۔ تم نیلگوں آسمان میں قیام پذیر ہو۔ اور اکثر میرے پردوں میں جھانکا کرتے ہو۔ کیونکہ جب تک سورج نہیں نکلتا - تم اپنی منور آنکھیں بند نہیں کرتے -

تمہاری چھوٹی سی چمکدار اور ننھی چنگاری اندھیری رات میں راہگیروں کی رہنمائی کرتی ہے - اگرچہ میں نہیں جانتا کہ تم کیا چیز ہو - تاہم
ننھے ستارو تم جگمگ جگمگ کرو۔

(جیم ٹایئر)

بیوہ کا چراغِ حیات

(۱)

سوشیلا ادھیڑ عمر کی عورت تھی۔ اس کے حسن و اخلاق
نے محلہ والوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔ اس کے پتی دیو دو
سال ہوئے اس جہان فانی سے راہی ملک عدم ہو گئے تھے۔
سوشیلا کی زندگی اُن کے بغیر اس چراغ کی مانند تھی۔ جس
میں تیل نہ ہو۔

لیکن قدرت نے بچے کو مقناطیس بنایا ہے۔ جس کی
محبت کی کشش سے ماں خود بخود کھچی جاتی ہے۔ یہاں
تک کہ اپنی جان اس کے معمول سے دُکھ کے بدلے
دینے کو تیار ہو جاتی ہے۔ بچے پر ننھی سی مصیبت آئی
ہوئی ماں کا کلیجہ مسل کر رکھ دیتی ہے۔ وہ اپنی ہستی
کو بھول کر مصیبت کے وحشتناک طوفان خیز سمندر
میں کود پڑتی ہے۔ جس کے ننھے سے بے لوث دل
کی ننھی سی برافروختگی کے سامنے دنیا کا جاہ جلال
ہیچ ہے۔ اس کی ضد کے آگے شہنشاہ کا تاج و تخت کوئی
نمایاں حقیقت نہیں رکھتا۔ بعینہ سوشیلا کا ٹمٹماتا ہوا

چراغ زندگی بھی موہن ــــ اُس کے لختِ جگر ــــ
اس کی تمام عمر کی کمائی ــــ کی ضیا سے پُر
نور تھا۔

شوشیلا۔ موہن اور صرف موہن کی محبت میں
بے خود رہتی تھی۔ مگر آسمان سے ستارے ٹوٹتے
اور جل اٹھنے دیکھنے اُسے منظور نہ تھے۔ موہن
بیمار ہو گیا۔

(۲)

شوشیلا جو اکثر نانِ جویں تک کی محتاج رہتی تھی۔
ڈاکٹر کا خرچ کس طرح برداشت کرتی۔ بیچاری مامتا
کی ماری حکیموں کے پیچھے دیوانہ وار پھرتی۔ جو کچھ
کسی نے کہا۔ اُس نے کیا۔ مندروں میں جا کر منتیں مانگیں۔
گھنٹوں دیوی کے پاؤں سے اپنی پیشانی کو رگڑا۔ مگر
جو ایشور کو منظور تھا وہی ہُوا۔ موہن کی حالت
بد تر سے بد تر ہوتی گئی۔ حتّٰی کہ چوتھے دن شوشیلا
کی امیدوں اور آرزوؤں کا یہ چراغ بھی گل ہو گیا۔
شوشیلا کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اُس کی چیخ و پکار
سے محلے بھر میں کہرام مچ گیا۔ محلہ والے دلی ہمدردی

سے اُس کے غم میں شریک تھے۔ مگر قدرت کے آہنی گرفت کا مقابلہ کرنا انسانی طاقت سے بعید ہے۔ بہیروں نے اُس کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن بے سُود۔

۳

اب اُس کے آنسو نہ رُکنے والی ندی کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ شوشیلا دیوانی ہو گئی۔ سارا سارا دن موہن۔ موہن کی رٹ لگائے شہر میں گھوما کرتی۔ کسی سے پوچھتی۔ کیا میرا موہن دیکھا؟" لڑکوں سے دریافت کرتی۔ "کیا موہن سکول گیا تھا؟" وہ اکثر شمشان میں جاتی۔ گھنٹوں موہن کی چتا پر بیٹھی رہتی۔ راکھ کو بوسے دیتی۔ آنکھوں سے لگاتی۔ اُس کی دل سوز آہ و بکا سے مرگھٹ کی دیواریں ـــــ پتھر دل دیوازیں بھی ـــــ جنہوں نے اس طرح کے لاکھوں واقعات دیکھے تھے۔ کانپ اٹھتی تھیں۔ اب شوشیلا کی آنکھوں میں آنسو نہ تھے۔ وہ صرف دل کی آگ میں جل کر خشک ہو چکے تھے۔ لوگ اُس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتے اور آہ بھر کر

چپ ہو جاتے۔

ایک دن شوشیلا حسب معمول مرگھٹ میں گئی۔ مگر خلاف معمول اُس کو ایک مہاتما کے درشن ہوئے۔ اس تپسوی منچ نے شوشیلا کو سب کچھ بھلا دیا۔ وہ لوہے کی طرح کھچی ہوئی کسی مقناطیسی اثر سے سادھو کے پاس گئی۔ اور اُس کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔ سادھو نے اُسے اٹھایا۔ اور گھنٹوں نامعلوم کیا اپدیش کرتا رہا

اُس روز کے بعد شوشیلا وہ پہلی شوشیلا نہ تھی۔ اُس کے پژمردہ چہرے پر وحشت کی بجائے خوشی اور غمگیں اور خشک آنکھوں میں نور اور نمی کی جھلک نمایاں ہوگئی تھی۔ اُس کے معمول میں بھی حیرت انگیز انقلاب واقع ہوگیا۔ وہ صبح اٹھتی۔ اپنے ہاتھ میں سفید چاک لیتی اور ہر دیوار پر "دُنیا فانی ہے" یہ الفاظ لکھ دیتی۔ وہ عموماً خاموش رہتی۔ مگر جب کبھی زبان کھولتی۔ تو "دنیا فانی ہے" کی گونج سنائی دیتی۔

(۱)

ایک غمناک دن کی شام کو انگلستان کا آفتاب اپنے حلقہ کے علاقہ کو دریائے خوبصورتی میں غرق کرتا ہُوا دُور پہاڑیوں پر غروب ہو رہا تھا۔ اس کی الوداعی رو پہلی کرنیں ایک نوجوان اور ایک حسینہ کے رخِ روشن پر پڑ کر آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔

نوجوان تھکاوٹ سے نڈھال تھا۔ اُس کی شکن آلود اور عرق ریز پیشانی جھکی ہوئی تھی۔ حسینہ کی پریشان زلفیں بادِ صرصر کے مشک بار جھونکوں

میں لہرا رہی تھیں - اُس کے لبوں کی رنگت شدت خوف سے کانچ کی مانند سفید تھی - دونوں سہمے ہوئے ایک دوسرے سے چمٹ رہے تھے - حسینہ لبوں پر آئے ہوئے لفظوں کو روکنے کی فضول سعی کر رہی تھی -

"گھنٹہ آج رات بجنا نہ چاہیئے -

(۲)

"سیکٹن ! ---"

بیسی کے سفید ہونٹ جیل کی سیاہ چار دیواری اور بھیانک پھاٹک کی طرف نگاہ جاتے ہی لرز کر رہ گئے - آواز گلے میں آکر رک گئی - اُس نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرد آہ بھری - پھر خود سے کہا -

میرا پیارا شوہر اس زنداں میں مقید ہے - اور آج رات گھنٹہ بجنے پر نذر اجل کیا جاوے گا - آہ ! مجھے کسی سے امداد کی توقع نہیں - اور شاہ کردم ویل بھی غروب آفتاب سے پیشتر نہ آسکیں گے -

اسی دہشت خیز خیال کے آتے ہی حسینہ کے چہرے پر

ہوائیاں اڑنے لگیں۔ یاقوتی ہونٹوں پر حسرت ناک سفیدی نے قبضہ کر لیا۔ رخساروں کی رنگت زرد پڑ گئی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"گھنٹہ آج رات نہ بجنا چاہیئے۔

(۳۱)

آفتاب لمحہ بہ لمحہ اپنی تاریک خواب گاہ کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ بوڑھا سیکٹن اپنی مختصر کوٹھڑی کی چوکھٹ پر بیٹھا ہوا خود بخود کسی غیبی جوش کے زیر اثر بڑبڑا رہا تھا۔

"اس اوداس اور تاریک مینار میں میں نے کئی سال گھنٹہ بجایا ہے۔ ہر شام کو سورج غروب ہو جانے کے بعد۔ جب کہ نیلے آسمان پر ہنوز ستارے ٹمٹما رہے ہوں۔ میں نے اپنا فرض مقررہ وقت پر ایمان داری سے ادا کیا ہے۔ بیشک اس وقت ماضی کی وہ رنگیناں مہیا نہیں —— نوجوانی کے ایام دھندلا سا خواب رہ گئے ہیں —— جسم کی تمام قوتیں ایک ایک کر کے جواب دے چکی ہیں —— کیا ہُوا؟ اس پر بھی اپنے فرض سے کوتاہی نہیں کر

سکتا!"

"گھنٹا آج رات ضرور بجے گا۔"

(۴)

بیسی کا بال بال لرز رہا تھا۔ چشم پُر نم تھے۔ چہرہ زرد تھا۔ دل دھڑک رہا تھا۔ اور پیشانی پر فکر و تشویش سے شکن پڑ رہے تھے۔ اس نے اپنے خوف زدہ اور بیکل دل میں ایک عہد کیا۔ اور ساتھ ہی اُس کی آنکھوں کے سامنے دو خوفناک نظارہ سینما کی متحرک تصاویر کی طرح پھر گیا۔ جب جیوری نے سنگ دلی سے بغیر آنسو بہائے یا سرد آہ بھرے حکم سنایا تھا۔

"گھنٹے کے بجنے پر بیسل انڈوڈ کو پھانسی کے تختہ پر چڑھا دیا جاوے"!

اب اُس کی سانس تیزی سے چلنے لگی۔ آنکھوں سے اشکوں کا سیلاب جاری ہو گیا۔ اس کی زبان سے تھرائے ہوئے الفاظ نکلے۔

"گھنٹہ آج رات نہ بجنا چاہیئے"۔

(۵)

حسینہ چوروں کی طرح دبے پاؤں شب کی ظلمت میں آگے بڑھی ۔ اور گرجے کے بوسیدہ پھاٹک پر پہنچی ۔ مگر وہاں ٹھہری نہیں ۔ اُس کا دل مثل سیماب تھا ۔ لیکن استقلال قایم ـــــ وہ گرد آلوُد زینے پر جہاں کئی سالوں سے بنی نوع انسان کے قدم نہ پہنچے تھے ۔ اندھوں کی طرح ٹٹولتے ہوئے چڑھنے لگی ۔ ہر جانب دہشت خیز سناٹا اور خوفناک تاریکی کا تسلّط تھا ۔ ایک چمگادڑ اس کے پاس سے پھڑ پھڑاتا ہوُا نکل گیا ۔ اس کے رو نگٹے کھڑے ہو گئے ۔ دل کی دھڑکن میں اضافہ ہوُا ۔ قدم ڈگمگا گئے ۔ چٹان ایسا مضبوط استقلال قایم نہ رہ سکا ـــــ وہ واپس ہونا چاہتی تھی ۔ کہ دل کی دھڑکن سے آواز پیدا ہوئی ۔

" گھنٹہ آج رات بجنا چاہیئے "

۶

وہ آخری زینے پر پہنچ چکی تھی ۔ اُس کے سر پر سیاہ دیو ہیکل گھنٹہ لٹک رہا تھا ۔

"گھنٹہ بجنے کا وقت قریب تر ہے" ـــ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی اُس کی سانس رُک گئی ـ چہرہ فق ہو گیا ـ کئی قسم کے بُرے خیال دل و دماغ میں پناہ گزیں ہو گئے ـ

"کیا میں گھنٹے کو بجنے دوں گی؟" ـــ نہیں! کبھی نہیں!! ـــ"

اس فوری خیال کے آتے ہی وہ مضبوطی سے گھنٹے کے موصل کے ساتھ چمٹ گئی ـ اس کے لب آہستہ آہستہ وا ہوئے ـ پھر انہوں میں جنبش آئی ـ

"گھنٹہ آج رات نہیں بجے گا!"

(۷)

بوڑھے اور بہرے سیکسٹن نے گھنٹے کے رسے کو اپنی تمام قوت سے ہلانا شروع کیا ـ اس نے گھنٹہ بجنے کی آواز نہیں سُنی ـ لیکن اس کا خیال تھا گھنٹہ بج رہا ہے ـ

اُدھر نوجوان بیسل کے سپرد خاک کرنے کا سامان بالکل تیار تھا ـــ حسینہ ابھی تک موصل سے لگی ہوئی تھی ـ دل کی دھڑکن کو روکنے کی سعی کرتے ہوئے

اُس نے لرزتی ہو آواز میں کہا۔
"گھنٹہ آج رات نہیں بجے گا۔"

۸

سب تمام ہو چکا تھا۔ گھنٹہ کی حرکت بند ہو چکی تھی۔ حسینہ نے ایک دفعہ کانپتی ہوئی خوف زدہ نگاہ گھنٹے پر ڈالی۔ پھر گرد آلود زینے پر واپسی قدم رکھا —— جو کچھ اُس رات اُس نازک اندام حسینہ نے کیا۔ وہ روزِ روشن کی طرح منور رہے گا۔

"گھنٹہ اُس رات نہیں بجا۔"

(۹)

دور پہاڑیوں پرے سے آتی ہوئی بینڈ کی شیریں آواز نے بتایا کہ شاہ کروم ویل آ رہے ہیں۔ حسینہ کی رگ رگ میں بجلی کی سی لہر دوڑ گئی۔ چہرہ تمتما اٹھا۔ آنکھیں مسرت سے اشکبار ہو گئیں۔

اُس نے شاہ کروم ویل کے سامنے دو زانو ہو کر اپنی داستانِ الم سنائی۔ اور اپنے لہو لہان ہاتھ دکھائے۔ ابھی تک اُسکا خوف و ہراس بالکل دور نہ ہوا

تھا۔

شاہ کروم ویل نے اُس کے سر پر شفقت آمیز ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "تمہارا خاوند زندہ ہے۔

اس دل خوش کُن خبر سُنتے ہی بیسی کے تمام جسم میں مُسرت کی برقی لہر دوڑ گئی۔ چہرے پر تسکین اور خوشی کے آثار ہویدا ہو گئے۔ آنکھوں میں خاص چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے شکریہ کے طور پر اپنا سر جھکا دیا۔

"گھنٹہ آج رات نہیں بجا۔"

شاہ کروم ویل کی آواز فضا میں غائب ہو گئی۔

(انگریزی)

(۱)

گاڑی علی گڑھ کے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ لوگ سوار ہونے کے لئے سرعت سے کام لے رہے تھے۔ ایک ڈبے کا سہارا لئے ڈاکٹر محمود کسی گہرے خیال میں مستغرق چپ چاپ کھڑا سگریٹ کے بادل آسمان کی طرف اڑا رہا تھا۔ رام پور کے نواب صاحب نے اپنی صحت درست کرنے کے لئے کلکتہ کے راستے دارجیلنگ جانا تھا۔ محمود ان کے خانگی ڈاکٹر تھے۔ اور اب اسٹیشن تک انہیں رخصت کرنے کے لئے آیا تھا۔ نواب صاحب کو آرام سے گدیلے پر

لٹا کر خود کھڑکی سے بیٹھ لگائے سیگرٹ پینے میں مشغول تھا۔ مگر دراصل اس کا تخیل نامعلوم کس خوفناک گتھی کے سلجھانے میں محو تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ اس پر خود فراموشی کا عالم طاری تھا ——— آخر اس نے اپنے خیال کا سلسلہ توڑا اور سیگرٹ کا نصف حصہ دور پھینکتے ہوئے نواب صاحب کی طرف دیکھ کر بولا۔

امید ہے اب دارجیلنگ آپ کی صحت اچھی ہو جائے گی۔"

اپنا تو یہی خیال ہے"

آپ کی غیر موجودگی میں آپ کے وزیر رعایا کی خوشحالی کا خیال رکھیں گے؟"

نواب صاحب کچھ دیر چپ رہے۔ اس کے بعد دھیمی آواز میں بولے "میں نے سب کچھ سوچ کر ہی اُس کے ہاتھ میں تمام انتظام دیا ہے۔ لیکن اس پر بھی اگر کچھ نقائص پیدا ہوں۔ تو آپ مجھے اطلاع دیں"

بہت اچھا! لیکن آپ یہ تو بتائیں کہ آپ اپنا وہ مشہور موتی اپنے ساتھ لے چلے ہیں یا اُسے بھی یہاں رکھے جاتے ہیں؟ ڈاکٹر نے نواب صاحب کے چہرے پر معنی خیز

نگاہیں ڈالتے ہوئے سوال کیا۔

واہ ڈاکٹر صاحب! یہ بھی آپ نے خوب کہی۔ وہ موتی مجھ سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ یہ دیکھئے وہ اب بھی میرے پاس موجود ہے۔

ان لفظوں کے ساتھ ہی نواب صاحب نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چمکتا ہُوا موتی نکال کر ہاتھ پر رکھ لیا۔ موتی کی پُر نور ضیاء سے کمرہ میں روشنی ہو گئی۔ موتی کو دیکھ کر ایک بار ڈاکٹر کی آنکھیں چمک اُٹھیں دل میں شعاع امید نمودار ہوئی۔ دو چار ادھر ادھر کی اور باتیں کرکے ڈاکٹر نے نواب صاحب کو سلام کیا اور اسٹیشن سے باہر نکل گیا۔

(۲)

شبِ ظلمت! گیارہ بجے کا عمل۔ ایک موٹر نہایت تیزی سے علی گڑھ ٹونڈلا روڈ پر جارہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ویران اور سنسان سڑک پہ۔ صرف روشنی کی ایک لکیر نظر آتی ہے۔ جو اس موٹر کے لیمپوں سے نکل رہی ہے۔ اس کے سوا دور تک کوئی اور روشنی نہیں۔ موٹر میں صرف ایک آدمی بیٹھا ہے۔ جو ڈرائیور کی ڈیوٹی ادا کر رہا ہے۔ اُس نے

موٹر مکمل رفتار پر چھوڑی ہوئی ہے ۔ موٹر کے ہنڈل پر داہنا ہاتھ رکھے وہ کسی خوفناک خیال میں غرق ہے ۔ ساتھ ہی کچھ بڑبڑاتا جاتا ہے ۔

" امید ہے ۔ ٹونڈلا پر ٹھیک پہنچوں گا ـــ موٹر ـــ بالکل موزوں ہے ۔ ۔ ۔ جھاڑیوں میں ـــــ پھر ٹکٹ ـــ کانپور کا ـــــ موتی جیب میں ہی ہے ـــــ واپس ـــ ندی پر ـــ گھر ـــ "

اس کی انہیں باتوں میں ٹونڈلا اسٹیشن کے لمپ نظر آنے لگے ۔ اس نے اسٹیشن کے لمپ نظر آنے لگے ۔ اس نے اسٹیشن سے چند قدم کے فاصلے پر موٹر روکی ۔ اور سڑک سے قدرے ہٹ کر جھاڑیوں کے جھنڈ کے پیچھے کھڑی کر دی ۔ پھر ایک ہینڈ بیگ ہاتھ میں لیا اور پیدل ہی اسٹیشن کی طرف روانہ ہوگیا ۔ وہ اس وقت ایک مولوی کے بھیس میں تھا ۔ منہ پر لمبی ڈاڑھی بڑی بڑی مونچھیں ۔ گلے میں گھٹنوں تک کوٹ ۔ ٹانگوں میں بہت چوڑا پاجامہ ۔

وقت پر گاڑی آئی اور وہ آدمی خلق کی نظر سے بچتا ہوا ایک فسٹ کلاس کے کمرے میں داخل ہوگیا ۔ یہ کمرہ

نواب صاحب کا تھا - جو اس وقت عالم سے بے خبر باآرام
سو رہے تھے ۔ اُس آدمی نے اندر داخل ہو کر پہلے
تو نواب صاحب کی طرف دیکھا پھر ایک بار باہر
کی طرف دیکھا - بعد میں کوٹ کی اندرونی جیب
سے ایک لمبا چاقو نکالا جس پر ذیل کی عبارت سنہری
لفظوں میں کھدی تھی -

"نواب رام پور کی طرف سے

ڈاکٹر محمود کو بطور تحفہ"

ڈاکٹر نے ایک لمحہ کچھ سوچا - اس وقت اُس کی آنکھوں
میں دہشت انگیز چمک تھی - آہستہ آہستہ اُس کا
ہاتھ اوپر اُٹھنا شروع ہُوا - اور اس کے بعد چشم زدن
میں نواب صاحب کی گردن میں داخل ہوگیا -

"ہائے ـــ ظالم"!! صرف دو لفظ نواب صاحب کی
لرزتی ہوئی زبان اور روندے ہوئے گلے سے نکلے اس
کے بعد روح ہوا میں پرواز کر گئی -

ڈاکٹر نے نواب صاحب کی جیب میں ہاتھ ڈالا - اور
موتی نکال کر للچائی ہوئی نگاہوں سے اُسے دیکھا دیکھتے
ہی اُس کے چہرے پر مسرت کی سرخی دوڑ گئی - پھر

موتی جیب میں ڈال لیا۔ ایک رومال نکال کر اپنے ہاتھ صاف کئے۔ اپنی ڈاڑھی۔ مونچھ۔ لمبا کوٹ اور چوڑا پاجامہ اُتار ڈالا۔

کوٹ اور پاجامہ اتارتے ہی اس کی شخصیت میں نمایاں فرق پڑ گیا۔ اُس نے ہینڈ بیگ سے انگریزی ٹوپی نکال کر پہن لی۔ اب وہ بالکل اینگلو انڈین تھا۔ اُس نے خون سے بھرے ہوئے کپڑے اور چاقو اس خالی بیگ میں بند کیا اور پچھلی طرف سے ہوتا ہوا اپنی موٹر کے پاس آگیا۔

یہ تمام کام کچھ اتنی تیزی سے کئے گئے تھے۔ کہ ابھی گاڑی کی روانگی میں چند منٹ باقی تھے، جب اس نے اپنی موٹر سڑک پر لا کر کھڑی کر دی۔ بیگ موٹر میں رکھا اور موٹر چل پڑی ــــ چند سیکنڈ کے بعد موٹر ایک دریا کے پل پر کھڑی تھی۔ اُس نے موٹر سے سر نکالا چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف ندی کے بہاؤ کی شاں شاں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ ندی کی چھاتی پر نیلگوں آسمان اور ستاروں کا عکس رقص کر رہا تھا۔ اُس نے بیگ ہاتھ میں اٹھایا۔ اس کے بعد دریا

کی شاں شاں میں ایک مہیب آواز پیدا ہوئی اور بس۔
اب موٹر پھر تیزی کے ساتھ علی گڑھ کی طرف جا
رہی تھی۔

(۳)

علی گڑھ میں کوچہ شہر جنگ کے اندر ایک جوہری کی
دوکان تھی۔ علی گڑھ کے گرد و نواح میں جتنی چوریاں ہوتی
تھیں۔ اُن سب کے مال کی کھپت یہی ہوتی تھی۔
دوکان کے مالک لالہ مانک چند واقع ہی مانک چند تھے۔
کیا مجال جو کوئی آنکھوں میں دھول ڈال جائے۔ انہیں
کھرے کھوٹے کی خوب پہچان تھی۔ ایک آنکھ دیکھتے
ہی پہچان لیتے تھے۔ کہ یہ نقل ہے یا اصل۔
دوسرے دن شام کو ڈاکٹر محمود مانک چند کی دوکان
پر پہنچا۔ اور موتی نکال کر جوہری صاحب کے ہاتھ پر
رکھتے ہوئے بولا۔ لالہ جی دیکھئے کس قیمت کا مال ہے؟
لالہ نے موتی دیکھا۔ آنکھیں لال ہوگئیں۔ بولے۔ واہ
ڈاکٹر صاحب دھوکہ مجھ سے ہی کرنا تھا۔ ایک کانچ
کے ٹکڑے کو موتی ظاہر کرنا یہ آدمیت میں داخل
نہیں۔

"کانچ کا ٹکڑا"!

ڈاکٹر نے حیرت خیز نگاہوں سے موتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں کانچ کا ٹکڑا" اس کی قیمت ایک معمولی کانچ کے ٹکڑے سے زیادہ نہیں۔ جوہری نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"پھر دیکھ لیجئے ـــ شاید ـــ!"

"معاف کیجئے ڈاکٹر صاحب آپ کو کسی نے دھوکہ دیا ہے۔ یہ تو نقلی موتی ہے۔ ہاں اس کے بنانے والا ایک قابل استاد اور تعریف کے لائق آدمی ہے۔

ڈاکٹر نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے موتی اٹھالیا۔

(۱۴)

دوسرے دن کے اخبار نواب صاحب کے قتل کی خبر سے بھرے پڑے تھے۔ پولیس نے قاتل کو بہت تلاش کیا۔ لیکن ناکام رہی۔ نواب صاحب کا وصیت نامہ کھولا گیا۔ انہوں نے وہی موتی ڈاکٹر کو نذرانہ پیش کیا تھا۔

ڈاکٹر کے دوست پھولے نہ سمائے۔ کیونکہ ایک بھاگے بھاگے ڈاکٹر کے گھر جا پہنچے۔

واہ! بھائی!! ڈاکٹر مبارک ہو۔

آخر ڈاکٹر نے تنگ آکر پوچھا۔ مبارک کی کیا بات ہے؟"

"پوچھتے کیا ہو؟ نواب صاحب تمہیں اپنا موتی دے گئے ہیں!"

"موتی۔ موتی کیسا؟"

"ہاں! ہاں!! موتی وہی خاندانی!"

"کیوں تنگ کرتے ہو کہاں دے گئے ہیں؟!"

"اس چاقو کے دستے میں جو انہوں نے آپ کو پچھلے سال تحفہ دیا تھا!"

یہ کہتے ہوئے اخبار نکال کر ڈاکٹر کے ہاتھ میں دے دیا۔

ڈاکٹر چونک اٹھا۔

"چاقو کے دستے میں —— موتی؟"

"ہاں! ہاں!! چاقو کے دستے میں موتی۔ یار۔ مٹھائی!"

پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی

ڈاکٹر پر گھڑوں پانی پڑ گیا پاؤں تلے سے زمین کھسک گئی۔

"ہائے! چاقو — بیگ میں — دریا کی لہروں سے ہم آغوش — ڈاکٹر نے سر پکڑ لیا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوُا۔ جیسے کوئی دوزخ کی آگ میں گھسیٹ رہا ہے"!
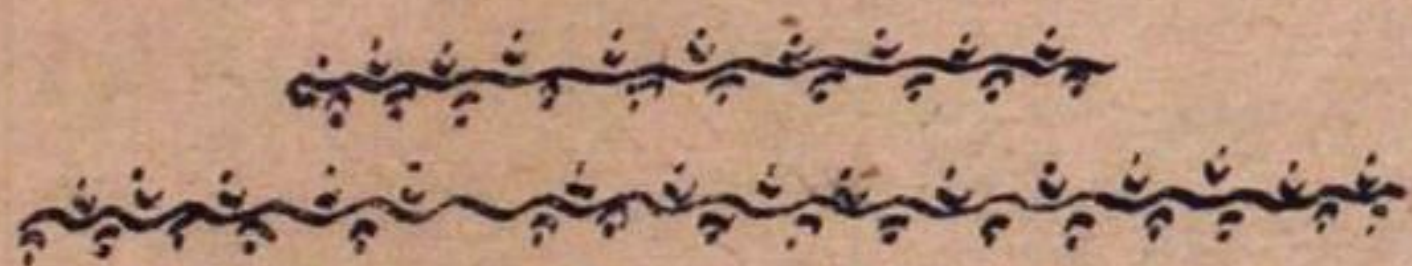
مطلبی دُنیا

"یہ کیا ہے؟"
"کا سا ہے!"
"کس لئے؟"
"رہنے دو! کیوں پوچھتے ہو؟"
"اور یہ لمبی چھڑی کیسی ہے؟"
"یہ ــــ لاٹھی ہے!"
"کیوں کسی کو مارنے کے لئے؟"
"نہیں ــ!"
"یہ سر پر کیا ہے؟ اور کمر میں یہ پھٹا ہُوا ــــــــ میلا کچیلا کپڑا کیسا ہے؟"
"اجی یہ تو پگڑی ہے۔ صرف دو گز پھٹی ہوئی۔ اور سی ہوئی۔ اور یہ ــــ دھوتی ہے!"
"تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"جہاں پڑا رہوں۔"

"تمہارا کوئی رشتہ دار بھی ہے؟"

"تھے لیکن اب نہیں۔"

"وہ کہاں گئے؟"

"کہیں بھی نہیں۔"

"کیسی عجیب بات کرتے ہو۔ کیا وہ تم سے ناراض ہو گئے؟"

"نہیں مگر قدرت ناراض ہو گئی ہے۔"

"یعنی؟"

"قسمت کا چکر۔ وہ دولت مند ہیں میں غریب ہوں۔ دنیا میں کوئی کسی کا نہیں۔"

"کام کیا کرتے ہو؟"

"گھر گھر پھرتا ہوں۔ در در دھکے کھاتا ہوں۔ گالیاں سنتا ہوں۔ اتنا ہونے پر بھی کچھ نہ کچھ کام ـــــ

ہاں! ہاں!! بتاؤ کیا کام کرتے ہو؟"

"نہ پوچھو! کچھ نہ پوچھو!! بہت ذلیل کام ہے۔ بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔

"کیوں کوئی ایسا ہی نیچ کام ہے۔ چوری کرتے ہو؟ ڈاکہ ڈالتے ہو؟"

"نہیں"

"کیا جواری ہو؟"

"نہیں بھائی۔ دولت ہی کہاں۔ جس سے جُوا کھیلا جا سکے"

"تو پھر کیا کرتے ہو خاک؟"

"مَیں بھیک مانگتا ہوں"

"تو تم بھکاری ہو؟"

"ہاں ——"

پھول اور سورج

کلی تب تک معصوم ہے۔ جب تک شگفتہ نہیں ہوتی۔ کلی چاہے کتنی ہی بڑی کیوں نہ ہو وہ کلی ہی ہے۔ اور معصوم ہے۔ اور جب کھل پڑے پھر پھول۔ معصومیت ختم ہو گئی۔

کلی تب تک نہیں کھلتی جب تک سورج کی تپش اس سے ہمکنار نہیں ہوئی۔ لیکن جب بادِ صبا میں ٹھنڈک نہیں رہتی اور وہ گرمی محسوس کرتی ہے۔ تب کھلنا شروع ہوتی ہے۔ سورج کی آمد سے پیشتر وہ جوان ہوتی ہے۔ لیکن شگفتہ نہیں۔

رات پھولوں موتیوں کا ہار پہناتی ہے۔ اور وہ خود بھی ستاروں سے جڑی ہوتی ہے۔ اس وقت پھول نہایت خوبصورت معصوم ہوتے ہیں۔ لیکن سورج یہ پسند نہیں کرتا۔ وہ خود حسین نہیں اس لئے اُسے پھولوں کا حسن نہیں بھاتا۔ وہ اُسے مٹا دیتا ہے۔

"محبت"

ہاتھ ہاتھوں کو پکڑتے ہیں۔ نگاہیں نگاہوں کے ہمکنار ہوتی ہیں۔
بس یہی الفت کی ابتدا ہوتی ہے۔

ماہ مارچ کی خوشگوار چاندنی شب ہے۔ بادِ صر خوشبو حنا سے معطر ہے۔ میں اپنی رسیلی بانسری فرشِ خاکی پر رکھ کر بھول گیا —— تمہارا پھولوں کا ہار ابھی تک نامکمل ہی ہے.... تمہارے اور میرے درمیان یہ اچھا اور پوتر پریم دلکش گیت کی طرح بناوٹ سے بالکل مبترا ہے۔

(۲)

تمہارا کیسری نقاب میری آنکھوں کو شراب پلا رہا ہے۔ چنبیلی کا ہار جو تم نے میرے واسطے تیار کیا ہے۔ تجسس کی طرح میرے دل میں مدو جذر کا عالم بپا کر رہا ہے۔ اچھلنے اور دبا رکھنے نقاب اٹھانے اور پھر ڈال دینے۔ قدرے مسکراہٹ معمولی حیا۔ میٹھی میٹھی ہاتھ پائی یہ تمام کھیل کیسا منو ہر ہے۔

تمہارے اور میرے درمیان یہ اچھا اور پوتر پریم دلکش گیت کی طرح بناوٹ سے بالکل مبرا ہے۔

(۳)

یہ مستقبل کا معجزہ نہیں۔ نہ نا کامی یا ناممکن کیلئے ناکام سعی ہیں۔ چاندنی کے پردہ میں ظلمت ہیں۔ حسن کے پردہ میں بدصورتی ہیں۔ اور نہ ہی بحر بے پایاں میں غوطہ زن ہے۔

تمہارے اور میرے درمیان یہ اچھا اور پوتر پریم دلکش گیت کیطرح بناوٹ سے بالکل مبرا ہیں۔

(۴)

ہم تمام الفاظ چھوڑ کر ابدی خاموشی اختیار نہیں کرتے ہم ناممکن کیلئے ہاتھ نہیں اٹھاتے۔ جو کچھ ہم دیتے آئے ہیں۔ وہی کافی ہے۔ ہم نے مسرت کو اتنا کھینچا کہ درد کی شراب برآمد ہو۔

تمہارے اور میرے درمیان یہ اچھا اور پوتر پریم دلکش گیت کی طرح بناوٹ سے بالکل مبرا ہے۔

ٹیگور

کافی نیچے جمنا خاموش موجوں میں بہہ رہی تھی۔ اُس کا اونچا ساحل جھک گیا تھا۔ پہاڑیاں گھنے درختوں کی وجہ سے خوفناک اندھیری ہو رہی تھی۔ مسلسل موسلادھار بارش نے جاری گڑھے بنا دیئے تھے۔

شری گورو گوبند سنگھ جی وسیع چٹان پر بیٹھے کتاب مقدس کے مطالعہ میں مستغرق تھے۔ اُن کا چیلا رگھوناتھ صاحب ہوا۔ اور قدم چوم کر بولا۔

"حضور کی خدمت میں ایک ناچیز تحفہ لایا ہوں۔

یہ کہتے ہوئے دو طلائی چوڑیاں نکال کر رکھ دیں۔ جن نادر جواہرات لگے تھے۔ اور اُن کی چمک اندھیرے میں اجالے کی لہر پیدا کر رہی تھی ــــــ مہاراج ایک چوڑی اُٹھا کر سدرشن کی طرح گھمانے لگے۔ جو ہرات کی تیز نور فشاں کرنیں چاروں اطرف پھیل گئیں... اچانک چوڑی انگلی سے نکل کر کتاب سے ٹکرائی اور پانی میں جا گری۔

"افسوس"

رگھوناتھ چلایا اور دریا میں کود پڑا - گورو نے اپنی نگاہیں کتاب کی طرف پھیر لیں - ندی نے جو کچھ حاصل کیا تھا - مضبوط پکڑ لیا - اور اپنی گہری تہ میں چھپا کر مسلسل بہتی رہی۔

سورج دو پہاڑیوں میں غروب ہو رہا تھا۔ جس کی الوداعی سنہری کرنیں سامنے برف کی پر پڑ کر آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہی تھیں - جب رگھوناتھ سعی لاحاصل سے تھکا ماندہ واپس لوٹا تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ ہانپتے ہوئے کہنے لگا۔

"مہاراج! اگر یہ معلوم ہو سکے کہ چوڑی کس جگہ گری تھی! تو یقیناً میں اسے اب بھی تلاش کر سکتا ہوں"۔

گوروجی یہ سن کر مسکرائے - اور دوسری چوڑی اٹھا کر جمنا میں پھینکتے ہوئے بولے -

"اس جگہ ——!"

رگھوناتھ گوروجی کے قدموں پر گر پڑا - اس کے آنسوں مہاراج کے پاؤں دھونے لگے —— کیونکہ اب وہ طلائی چوڑیوں سے بیش قیمت روحانی سرور حاصل کر چکا تھا - مہاراج نے ایک نظر اسے دیکھا پھر اٹھا کر چھاتی سے لگا لیا -

عورت اور اہل فارس

ایرانیوں نے سولہ سال کی عمر سے لے کر چالیس سال تک عورت جو تنقید کی ہے وہ خالی از لطف نہیں۔ چنانچہ اِن کا بیان ہے کہ۔

چودہ سال کی عورت اُس برگ پوش گلاب کی وہ کلی ہے۔ جس کا ابھی تک نہ رنگ ظاہر ہُوا اور نہ خوشبو۔

پندرہ سال کی عورت اِن کے نزدیک سرو کا درخت ہے۔ جسے نسیم کا ہلکا جھونکا بھی جھکا دیتا ہے"۔

سولہ سال کی عورت ایک چشمہ ہے۔ جو تنکوں اور پتیوں سے ڈھکا ہُوا ہے۔ لیکن اس کے نیچے شفاف پانی لہریں لے رہا ہے"!

۱۷ سال پُور نما کا صاف مکمل چاند۔

۱۸ سال۔ دوپہر کا چڑھتا آفتاب ہے جو آنکھوں کو چندھیا دیتا ہے۔

۱۹ سال پختہ رنگین سیب ہے کہ اگر کوئی اس کو توڑنے

والا نہیں ہے تو زمین پر۔ گر کر مٹی میں مل جائیگا۔

۲۰۔ سال ۔ دہی پوری طاقت کے ساتھ دوپہر کا سورج ہے ۔

۲۱۔ سال گھنا صنوبر۔ کا درخت ہے، جس کے سایہ میں لوگ راحت پاتے ہیں ۔

۲۲۔ سال ایک رباب ہے جس کے تاروں سے نغمے نکل کر لوگوں کو مست کر دیتے ہیں ۔

۲۳۔ سال۔ ہرنی ہے جسے شکاریوں نے گھیر رکھا ہے ۔

۲۴۔ سال۔ وہ سُریلا گیت ہے، جس کے مقابلہ کا خوبصورت گیت آج تک کوئی لکھ ہی نہیں سکا۔

۲۵۔ سال ۔ پربھات کی ہلکی ٹھنڈی ہوا ہے۔ جو بدمستوں کو جگا دیتی ہے ۔

۲۶۔ سال ۔ گلاب کا پھول ہے، جو پوری طرح کھِل چکا ہے ۔ اور دیکھنے والا چاہتا ہے ۔ کہ اس کو توڑ کر اپنے سرو سینہ سے لگا لے

۲۷۔ سال ۔ پورنما کے دوسرے دن کا چاند جو گھٹنے والا ہے ۔

۲۸۔ سال۔ ایک باغ ہے، جس میں خزاں کے آثار شروع ہو گئے ہیں

۲۹۔ سال۔ ایک دل کش آواز ہے، جو تاریک رات میں دور سے سنائی دے اور کانوں کو بھلی معلوم ہو۔

۳۰۔ سال ۔ قدیم روایت ہے ۔ جس کا کسی وقت بڑا شہرہ ہو چکا ہے ۔

۴۱ سال معطر پھولوں اور پختہ پھلوں سے لدا ہوا ایک درخت ہے لیکن آخری موسم کا۔

۴۲ سال۔ شمع ہے ٹمٹماتی ہوئی۔

۴۳ سال۔ ایک کتاب ہے، جس کی جلد ٹوٹ گئی ہے، اوراق منتشر ہیں۔

۴۴۔ سال ایک خوبصورت شیشی ہے، جو کسی وقت عطر سے بھری تھی لیکن اب اس میں آثار خوشبو باقی رہ گئے ہیں۔

۴۵ سال۔ ایک ضعیف سی روشنی ہے، جو غروب آفتاب کے بعد ہی نظر آسکتی ہے۔

۴۶۔ سال پچھلے پہر کا تارا ہے۔ جو جلد غروب ہونے والا ہے

۴۷۔ سال کسی مقفل مکان کے اندر کی آواز ہے۔

۴۸۔ سال۔ گرم پانی کا پیالہ ہے۔ جو گرمی میں کسی پیاسے کو دیا جائے

۴۹۔ سال۔ پرانی عمارت ہے۔ جس میں سوائے مٹے ہوئے نقش و نگار کے اور کچھ باقی نہیں۔

۵۰ سال۔ ایک حمام ہے، جس میں ہوا کیلئے کوئی راستہ نہیں اور اگر انسان اس کے اندر آجائے تو دم گھٹ کر مر جائے۔

ملازم کی بچی

دن نکل آیا مگر میرا ملازم نہ آیا۔
تمام کیواڑ کھُلے تھے۔ کوئیں کا پانی بدستور ساکن تھا۔ ابھی وہاں کسی نے برتن نہیں ڈالا تھا۔ میرا ملازم تمام شب باہر ہی رہا۔ میرا کھانا تیار نہ تھا۔ تمام کپڑے بے ترتیب اور بکھرے پڑے تھے۔ وقت گذرتا گیا اور میرے غصہ میں اضافہ ہوتا گیا۔
میں اس کی سزا کے لیے نئی نئی باتیں سوچ رہا تھا۔ کہ وہ حاضر ہُوا۔ اب دن کافی سے زیادہ چڑھ چکا تھا۔ اس نے جھک کر آداب کیا۔

میں غصے سے لرزتے ہوئے جوش میں کہا۔ میرے سامنے سے ہٹ جاؤ۔ اور آئندہ کبھی مجھے اپنا منحوس مُنہ دیکھانے کی جرات نہ کرنا اس نے میری طرف آبگونگاہ آنکھوں سے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں حسرت تھی۔ وہ چند سیکنڈ خاموش رہا۔ پھر مدہم اور روندے ہوئے گلے سے بولا۔ میری ننھی بچی گذشتہ شب کو اس جہاں سے رخصت ہوگئی ہے۔ بس اب بغیر کوئی لفظ زبان سے نکالے وہ حسب معمول کام میں لگ گیا۔

ٹیگور۔ گارڈنز۔

برسات

ساون آیا — دریا کے ساحل پر بگلوں سارسوں کے جوڑے خوشیاں منانے لگے۔

برسات نے دریا کے پانی کو مٹیالا کر دیا۔ لیکن لہروں میں نئی روح پھونکی گئی سیاہ اور مست مخمور بادل بدمست ہاتھیوں کی طرح جھوم جھوم آئے ۔۔۔ آئے اور چلے گئے۔ دریا پار —— اُس ساحل پر — سکھیوں نے جامن کے پیڑ میں رنگین جھولے ڈالے۔ اس طرف سے

"آؤ سکھی ری جھولا جھولیں۔

کی مدھم آواز سنائی دی۔ اور ادھر سے

پیا ملن کی آس

ترنم خیز دھن سنائی دی۔ بگوان پکے گرڑ ہائے چڑھائے گئے جنگل میں منگل ہو گیا۔

آنکھوں میں ساون ختم ہوا۔ مگر پیا رے مدن موہن کی منوہر صورت کہیں بھی دکھائی نہ دی —— میں دریا

کے نمدار ساحل پر کھڑی یہ تمام دلکش تماشا دیکھ رہی تھی۔

میرے من مندر کے دیوتا ساکشات نہ آئے۔ ہردے کی پکار بھی نہ سن کوئل کی کوک نے برہ اگن اور بھی پرچنڈ کر دی دریا کا پانی آگ کے شعلوں کی طرح بھڑک اٹھا۔

پُر نم آنکھوں میں ساون کا جل چھلک رہا تھا۔ روکنے پر بھی نہ تھم سکا خوب دل کھول کر برسا۔ میں بھیگ گئی۔ اب مدن موہن ساکشات براجمان تھے۔ دریا کا پانی اتر گیا تھا۔ فلک بالکل صاف تھا۔ تالاب کی سطح ساکن تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ کہ میں صرف یہی کہہ سکی ہے

اب کس کارن شیام ساون بیت گیا

ہندی

دو چیزیں

میں سبزہ زار پر ہلکا پھلکا چہل قدمی کر رہا تھا ... کسی نے پشت سے پکارا۔

"مجھے پہچانتے ہو؟"

میں نے گھوم کر دیکھا۔

نہیں تمہارا نام تو مجھے یاد نہیں" میں نے تعجب کو چھپاتے ہوئے جواب دیا۔

میرے اس جواب پر اُس نے خاص قسم کے لعب ولہجہ میں کہا۔

"میں وہ مصیبت ہوں۔ جسے تم نے پہلے پہل اپنی زندگی میں جھیلا تھا۔

اس وقت اس کی آنکھوں میں وہ کیف تھا جو شبنم کے موتیوں سے دھوئے ہوئے صبح کے رُخ روشن پر ہوتا ہے۔ ... چند منٹ چپ رہ کر میں نے دریافت کیا۔

"تمہاری آنکھوں کے آنسو کیا خشک ہو چکے ہیں؟"

وہ دیر لب میں آئی۔ مگر کچھ جواب نہیں دیا۔ میں سب سمجھ گیا کہ وقت پا کر آنسوؤں نے بھی تعلیم تبسم حاصل کر لی ہے — اب اُس نے آہستہ سے کہا۔

"تم تو کہتے تھے میں اس مصیبت کا تازیست فراموش نہ کرونگا۔
مگر —— برخلاف اس کے آج —— ؟"

ہاں وقت گزرنے کے ساتھ ہی مجھے بھی صبر حاصل ہو گیا۔
میں نے شرما کر نیچی نگاہیں کرتے ہوئے جواب دیا۔

پھر میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اُس
کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے شیریں لہجہ میں کہا۔

مگر اب تم بھی تو بدل گئی ہو نا —— !

وہ پھر مسکرائی اور بولی۔ جس کا نام کل مصیبت تھا۔ اب
راحت ہے!"

ٹیگور

پُراسرار تصویر؟

میں خیالات کے گہرے سمندر میں ڈوبا ہوا اپنے ڈرائینگ روم میں بیٹھا تھا۔ کہ یکایک ایک نوجوان اندر داخل ہوا۔ اُس نے بھورے رنگ کا اوور کوٹ پہن رکھا تھا۔ کالر کے سوراخ میں ایک سرخ پھول زینت دے رہا تھا۔ چہرہ تانبا کی طرح دمک رہا تھا۔ مونچھوں کے بال سنہری تھے۔

"آپ کا تار مجھے مل گیا تھا۔ اس لیے حاضرِ خدمت ہوا ہوں" اُس نے اندر قدم رکھتے ہی کہا۔

اگر مجھے آرسین لوپن کے آنے کی انتظار نہ ہوتی۔ اور ساتھ ہی اُس نے مندرجہ بالا الفاظ نہ دہرائے ہوتے۔ تو شاید ہی میں اُسے اس لباس میں پہچانتا۔

"نہیں معاملہ کوئی خاص ضروری تو نہیں۔ ایک معمولی سی بات ہے۔ مجھے یقین ہے۔ وہ آپکی مدد سے سلجھ جائے گی" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شائد — میں پیش از وقت قطعی فیصلہ نہیں کر سکتا" اس نے جواب دیا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ نے کسی دوسری جگہ بھی جانا ہے؟"

"ہاں! — مگر آپ میرے اشتیاق کو زیادہ نہ کریں۔ اور اصل معاملے کی طرف آئیں"

"میں خود بھی یہی چاہتا ہوں۔ سب سے پہلے اس دستی تصویر کو دیکھئے۔ جو چند دن ہوئے۔ میں نے ایک کواڑی کی دوکان سے خریدی تھی۔ جو دریا کی پرلی طرف واقعہ ہے۔ فریم تو بے شک قیمتی ہے مگر تصویر کو دیکھئے کتنی بھدی۔ کیسی فضول اور بالکل بے معنی ہے"

لوپن اس تصویر کو نہایت باریک بین نگاہوں سے پانچ منٹ تک مسلسل دیکھتا رہا۔ پھر سر اٹھا کر نہایت سنجیدگی سے بولا:

"آپ اس تصویر کو بھدی۔ خراب اور فضول کہہ سکتے ہیں۔ لیکن میں نہیں۔ شائد لاپرواہی سے کام لیا ہو۔ خیر نظارہ نہایت دلچسپ ہے۔ دیکھئے یہ رنگدار ستون چکر کی شکل میں کیا خوب صورت معلوم ہوتے ہیں یہ دھوپ گھڑی اور مچھلیوں کا تالاب کتنا دلکش ہے"

"ہاں۔ کسی اصل نظارے کی تصویر ہے۔ کچھ بھی ہو تصویر

اچھی ہو یا بُری اس فریم میں سے کبھی نکالی نہیں گئی۔ دیکھئے اس کے نیچے تاریخ بھی درج ہے ــــ وہ بائیں طرف ــــ کونے پر ــــ لال حروف ــــ ۵۹ــ4ــ15 یعنی 15-اپریل ۱۸۵۹ء"

لوپن نے لاپرواہی سے جواب دیا "ہو گا ــــ مگر تم کسی واقعہ کو بیان کر رہے تھے"

میں نے میبل کے دراز سے دوربین نکالی - پھر اس کو ایک مکان کی طرف پھیرا - جو میرے مکان کے بالکل مقابل کچھ فاصلے پر واقعہ تھا۔

"اس دوربین کے اندر دیکھنا"

سورج کی سنہری شعائیں اس وقت سامنے مکان کی کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو رہی تھیں - اس لئے ہر چیز نمایاں طور پر نظر آ رہی تھی - کمرے میں شیشم کی چند کرسیاں - ایک چھوٹا اور ایک بڑا پلنگ - خستہ سا میز - یہ مختصر سامان تھا۔

لوپن دوربین کے اندر دیکھ کر حیرت سے بولا "بالکل ایسی ہی تصویر سامنے لٹک رہی ہے"

"ہاں! بالکل ایسی ہی - یہی تاریخ اُس کے نیچے بھی لکھی ہے"۔

"ہاں! ہاں! تاریخ بھی لکھی ہے ــــ مگر یہاں رہتا کون ہے؟"

"ایک عورت — بالکل معمولی حیثیت کی مالک - اور اُس کی لڑکی عورت سلائی کا کام کر کے اپنے غربت کے دن گذار رہی ہے"۔

"اس کا نام؟"

"لوئی - ڈی ارنمانٹ! عام مشہور ہے کہ یہ ایک بہادر فرانیسی جرنیل کی اولاد میں سے ہے۔ جسے انقلاب فرانس میں قتل کر دیا گیا تھا - اُس کے بارے میں یہ بھی افواہ ہے - کہ وہ بہت مالدار تھا"۔

"بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ مگر آپ نے تو کبھی اس کا ذکر نہیں کیا"۔

"آج ہی تو پندرہ اپریل ہے"۔

"پھر؟"

"مجھے کل اس مکان کے ایک ملازم سے معلوم ہُوا کہ ڈی ارنمانٹ کے خاندان میں پندرہ اپریل کا دن ایک خاص شہرت رکھتا ہے۔

"یعنی؟"

"یہ عورت ہر شام کو اپنا کھانا خود تیار کرتی ہے۔ مگر جب ۱۵ اپریل کا دن آتا ہے تو دونوں ماں بیٹی صبح گھر سے نکلتی ہیں اور بہت رات گئے واپس آتی ہیں۔ کئی سال سے یہ دونوں اس طرح کر رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب یہی تاریخ دونوں

تصاویر پر لکھی ہے۔ تو ضرور لوئی کا تعلق ان تصاویر سے ہے"!

"مگر لوپن نے میری باتوں کا جواب نہ دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ آخر اس نے گردن اٹھائی اور کہا:

"تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن کیا یہ بھی معلوم ہے۔ کہ پندرہ اپریل کو ماں بیٹی کہاں جاتی ہیں؟"

"یہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ عورت خاموش رہنے والی ہے"!

"معاملہ پُر پیچ اور دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔

سامنے دروازے میں ایک چھوٹی سی لڑکی کھڑی تھی۔ اُس کی عمر سات آٹھ سال کے قریب ہوگی۔ تھوڑی دیر بعد ایک عورت داخل ہوئی اُس کا قد لمبا تھا۔ نقش و نگار خوبصورت تھے۔ مگر چہرے پر رنج و غم کے آثار نمایاں تھے۔ دونوں کہیں باہر جانے کے لئے تیار معلوم ہوتی تھیں۔ دونوں کے کپڑے معمولی مگر ستھرے تھے۔ میں نے کہا:

"دونوں جا رہی ہیں"۔

لوئی بیٹی کا ہاتھ پکڑے باہر نکلی اور بازار میں اتر گئی۔

لوپن نے اپنی ٹوپی اُٹھائی اور بولا۔
"چلو گے ؟"
چونکہ مجھے خود اس پراسرار راز کو جاننے میں اُنس اور دلچسپی سی ہو گئی تھی۔ اس لئے میں نے اُس کے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا۔ بازار میں ہم نے اُن کو ایک مختصر اور معمولی ہوٹل کے اندر جاتے دیکھا۔ عورت کے کچھ کھانا خریدا اور ٹوکری میں جس میں کھانے کی کچھ اور چیزیں پہلے سے ہی موجود تھیں۔ رکھ لیا۔ پھر دونوں بازار میں سے گذرتی ہوئی ایونیو کلمبر میں پہنچی اور پھر بالسی کی طرف مڑیں۔
لوپن اور میں دبے پاؤں اُن کا تعاقب کر رہے تھے۔ میرا دوست خیالات کے گہرے پانیوں میں غرق معلوم ہوتا تھا۔ آخر دونوں ماں بیٹی دریائے سون کے کنارے جا پہنچی۔ اس کے بعد ایک تنگ دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ جس دیواروں پر کاہی جمی ہوئی تھی۔ اور اُن کے کناروں پر حفاظت کے لئے ٹوٹے ہوئے شیشے کے ٹکڑے لگے ہوئے تھے۔ دیوار کی پچھلی طرف ایک محراب دروازہ تھا اُس نے جیب سے ایک بھدی سی زنگ آلود چابی لگائی۔ اور دروازہ کھول کر دونوں اندر داخل ہوئیں۔ آرسین لوپن میری

طرف دیکھ کر بولا:

"میرے خیال میں اس جگہ کوئی بات پوشیدہ رکھنے کے قابل نہیں۔ کیونکہ عورت نے ایک بار بھی پیچھے پھر کر نہیں دیکھا۔"

یونہی اُس کی زبان سے ابھی یہ الفاظ پوری طرح ادا نہ ہوئے تھے کہ پیچھے کی طرف سے ہمیں پاؤں کی آہٹ سنائی دی۔ جب مڑ کر دیکھا تو ایک خستہ حال بوڑھا فقیر تھا۔ اور اس کے ساتھ ایک بوڑھی عورت تھی۔ دونوں کے کپڑے جگہ جگہ پھٹے ہوئے اور گندے تھے۔ وہ چپ چاپ ہمارے پاس سے گذرے اور اسی دروازہ کے پاس پہنچ کر انہوں نے بھی ایک چابی نکالی۔ اور دروازہ کھول کر اندر چلے گئے۔ دروازہ بدستور بند ہوگیا!

اتنے میں ایک موٹر کی آواز سُنائی دی۔ ہم دونوں جھاڑیوں کے پیچھے ہوگئے۔ ہم نے ایک دوشیزہ کو بغل میں ایک کتا اُٹھائے موٹر میں سوار آتے دیکھا۔ وہ زیورات سے لدی تھی جسم پر قیمتی کپڑے تھے۔ اس کے بال لمبے اور سنہری مائل تھے۔ یاقوت کو مات کرنے والے ہونٹ اور آہوں کی سی تیز آنکھیں یہ لیڈی بھی اسی دروازہ پر آکر ٹھہری۔ چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ اور

اندر چلی گئی۔ لوپن مسکرا کر کہنے لگا۔ معاملہ بڑا ادلچسپ معلوم ہوتا ہے۔ خدا جانے ان لوگوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے یا۔!

اتنے میں ہمیں دُور سے دو دُبلی پتلی عورتیں آتی دکھائی دیں ہم دونوں پھر جھاڑیوں کے پیچھے ہو گئے۔ دونوں کے کپڑے غریبانہ سے تھے۔ اور ہم عمر معلوم ہوتی تھیں۔ پیچھے ایک آدمی چپڑاسی کی وردی پہنے آ رہا تھا۔ اور اس کے پیچھے پلٹن کا ایک پیادہ سپاہی۔ اس سپاہی کے بعد کچھ مزدور پیشہ لوگ تھے۔ ایک آدمی ایک عورت اور چھ بچے سب کے سب بہت غریب اور نانِ شبینہ سے محتاج نظر آتے تھے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک ٹوکری تھی۔ جس میں کھانے کا کچھ سامان موجود تھا۔ یہ سب لوگ اسی دروازہ کی راہ سے اندر چلے گئے۔ میں نے کہا "کسی خفیہ انجمن کا جلسہ معلوم ہوتا ہے"!!

عجب تماشا ہے۔ جب تک معلوم نہ کر لوں کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ مجھے چین نہ آئے گا!

دیوار پھاندنا ناممکن تھا۔ اور دونوں طرف سے وہ مکان کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔ اس میں کوئی کھڑکی یا دروازہ وغیرہ نہ تھا۔ گھنٹہ بھر تک کوئی آدمی نظر نہ آیا۔

اور ہم دونوں اس مکان میں گھسنے کی تجویز سوچتے رہے۔ آخر تنگ آکر لوپن نے کہا۔ کہیں سے سیڑھی لا کر کوشش کریں۔ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر ہی وہ سیڑھی کی تلاش میں جانے ہی والا تھا۔ کہ پھر دروازہ کھُلا۔ اور مزدور پیشہ آدمی کے بچے باہر نکلے۔ ان میں ایک بھاگ کر بازار کی طرف گیا۔ اور پھر جلد ہی بھاگتا ہُوا واپس بھی آگیا۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی دو صراحیاں تھیں جنہیں دروازہ کے پاس رکھ کر وہ جیب میں چابی تلاش کرنے لگا۔ لوپن دیوار کے سائے میں ٹہل رہا تھا۔ لڑکے نے دروازہ کھولا۔ اور اندر داخل ہو کر دوبارہ بند کرنا چاہتا تھا کہ لوپن نے ایک لمحہ میں چاقو چابی کے سوراخ میں ڈال دیا۔ لڑکے نے خیال کیا شائد دروازہ بند ہوگیا ہو۔ مگر دراصل ایسا نہ ہُوا۔ اب اندر داخل ہونا کوئی مشکل نہ تھا۔

پہلے تو لوپن نے آہستہ آہستہ دروازے کو دھکیلا پھر بغیر کسی خوف کے اندر داخل ہُوا۔ مَیں نے بھی اُس کی تائید کی۔ اندر سڑک کے کنارے کنارے دونوں طرف مسلسل چھوٹی چھوٹی خوشنما ہری جھاڑیوں کی قطار تھی۔ ہم ان

جھاڑیوں کے سائے میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ اور ایک جگہ سے ٹہنیاں ہٹا کر دیکھنے لگے!

نظارہ حیران کن تھا۔ دالان میں بالکل وہی صورت تھی جو اُس تصویر میں بنائی گئی تھی۔ جو ہماری نظر سے گذر چکی تھیں۔ اور جس پر 15/4/52ء تاریخ درج تھی۔ وہی یونانی طرز کے ستون پتھر کے بنچ۔ مچھلیوں کا تالاب اور دھوپ گھڑی۔ ہم دونوں یہ نظارہ دیکھ کر، اور پندرہ اپریل کا خیال کر کے اور زیادہ اُلجھن میں پڑ گئے۔ پُراسرار راز تھا۔ حیرت تھی۔ کہ طرح طرح کے پندرہ سولہ شخص کیوں اس مکان میں جمع ہیں۔ ان کا آپس میں کیا تعلق ہے! یہ سب آدمی الگ الگ گھاس پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ہمارے پاس ہی لوئی ار نمانٹ اپنی لڑکی کے ساتھ کھانا کھانے میں مشغول تھی۔ اس کی بغل میں مزدور آدمی اور اُس کے خاندانی کھانا کھا رہے تھے۔ سپاہی چپڑاسی دونوں ہم عمر عورتیں اور وہ موٹا بھدا سا آدمی وہ بھی ایک طرف بیٹھے تھے۔ وہ لیڈی جو کتا لے کر آئی آئی تھی۔ اکیلی چپ چاپ بیٹھی تھی۔ مگر لوئی نے اُسے کچھ کھانے کو دیا۔ اُس کے بعد سب نے تھوڑا تھوڑا دیا۔

اور وہ بھی گھانے لگی ؛

اس وقت ڈیڑھ بج چکا تھا - آدمی سگریٹ نکال کر ایک دوسرے کو دے رہے تھے - اور سب عورت مرد مل کر اس یونانی ستون والے دالان میں مٹرگشت کر رہے تھے - باہمی الفت ان تمام کی رگ رگ میں معلوم ہوتی تھی - ہم اُن کی گفت و شنید نہ سن سکے - کیوں کہ ہم میں اور اُن میں چند قدم کا فاصلہ حائل تھا - اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ سے اتنا ضرور معلوم ہوتا تھا - کہ گفت و شنید گہری دلچسپ ہو رہی ہے - وہ امیر کبیر لیڈی بہت جوش سے بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی - اور اس کا کُتا بھی اُچھل اُچھل کر بھونک رہا تھا - یکایک ایک طرف سے چلانے کی آواز سنائی دی - اور تمام بھاگ کر کنوئیں کی طرف چلے گئے -

مزدور اور اُس کا ایک لڑکا جس کی کمر میں رسی بندھی ہوئی تھی - کنوئیں میں تھا - اور اس کے دوسرے بھائی اسے باہر کھینچ رہے تھے - اتنے میں سپاہی اور چپڑاسی دونوں آگے بڑھے اور بچوں کے ہاتھ سے رسی لے کر اوپر کھینچنے لگے -

کچھ فاصلہ پر چند آدمی آپس میں لڑنے جھگڑنے لگ پڑے - اور ہاتھا پائی تک کی نوبت پہنچ گئی - بچوں کے میلے اور

پرانے کپڑوں کے چیتھڑے اڑ گئے۔ کئی لوگ ان ٹکڑوں کو لے کر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگے۔ اور بچے زور زور سے چلانے لگے۔ گویا پاگلوں کی سی حرکات کر رہے تھے۔

میں نے لوہن سے کہا "یہ لوگ پاگل تو نہیں ہو گئے؟"

"نہیں تم چپ رہو اور دیکھتے جاؤ۔"

"تمہارے خیال میں کوئی رسم ادا کی جا رہی ہے۔"

مگر لوہن نے کچھ جواب نہ دیا۔ جیسے اس نے سنا ہی نہیں اس وقت ایک عورت کتے کو بغل میں دبائے ایک بچے کے پیچھے جس کے سر پر ایک پھٹی ہوئی قمیض تھی۔ بھاگ رہی تھی۔ اور بچارہ کمسن بچہ چیخ چیخ کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔"

یہ دونوں بھاگتے ہوئے ہمارے پاس سے گذرے بچہ بھاگ کر اپنی ماں سے جا چمٹا۔ آخر کار لرئی ڈی ارنمانٹ جو ابھی تک خاموش بیٹھی تھی اٹھی اور سب کو کچھ کہہ کر اپنی اپنی جگہ بٹھا دیا۔ اب یہ لوگ بالکل خاموش تھے کچھ دیر بعد جب ہمیں بھوک نے ستایا تو میں اس دروازے سے باہر نکلا اور بازار سے کچھ کھانے کا سامان لے کر واپس لوٹا۔ ہم دونوں نے جھاڑیوں کی اوٹ میں کھانا کھایا۔

یہ لوگ ابھی تک سر جھکائے کسی گہری سوچ میں خاموش بیٹھے تھے۔ سب رنجیدہ معلوم ہوتے تھے۔ چہرے سے نا اُمیدی اور تکلیف کی جھلک نمایاں تھی۔ دوپہر کا وقت اسی حالت میں غروب ہونے لگے تھے۔ کہ میں نے اُکتا کر لوپن سے کہا :
کہ کیا یہ لوگ رات بھی یہیں گذاریں گے ؟ مگر اُس نے سُنا ان سُنا کر دیا۔ شاید وہ اپنے کانوں میں پگھلا ہُوا شیشہ ڈال کر ہمیشہ کے لئے سُننے والی قوت کو خیرباد کہہ چکا تھا۔ آخر شام کے پانچ بجے اس موٹے بھدے آدمی نے جیب سے گھڑی نکالی اور وقت دیکھنے لگا۔ سب عورت مرد خوش ہو کر اپنی اپنی گھڑیاں نکال کر دیکھنے لگے۔ اور کسی واقع کی بڑے شوق سے انتظار کرنے لگے۔ آخر پندرہ منٹ بعد اس موٹے آدمی نے نا امیدی کی حالت میں ہاتھ سر پر دے مارا اور گھڑی جیب میں ڈال لی۔ کیوں کہ جس چیز کی انتظار میں مضطرب معلوم ہوتے تھے۔ وہ نظر نہ آئی۔ سب نے گھڑیاں بند کر لیں۔ اور ہر طرف رونے اور آہیں بھرنے کی آواز آنے لگی۔ مزدور کے

خاندان کے لوگ اور دونوں ہم عمر عورتیں گھٹنوں کے
کے بل دُعا کرنے لگیں - اور ہوا میں "کراس"
بنانے لگیں -

زیورات والی لیڈی نے بھکاری کی بیوی کے
ماتھے کو بوسہ دیا اور دونوں نے مل کر آنسو بہائے
لوئی ڈی ارنمانٹ نے محبت سے اپنی بیٹی کو گلے لگایا
یہ دیکھ کر لوپن بولا - "چلو اب چلیں !"
"کیوں ؟"
"اب ہمیں باہر جانا چاہیئے !"

ہم دونوں تمام کی نظروں سے بچتے ہوئے وہاں سے
نکلے - کسی کو ہمارے آنے کا حال معلوم نہ ہُوا - بازار
کے ایک کونے پر پہنچ کر لوپن نے مجھے وہاں کھڑا کیا -
اور خود ایک طرف چلا گیا - اور ایک مکان کے چوکیدار
سے چند باتیں کر واپس آگیا - یہ مکان اس طلسمی مکان کے
پاس ہی تھا - جہاں ہم نے یہ حیرت انگیز نظارہ دیکھا
تھا - ہمیں راستے میں کرائے کی گاڑی مل گئی اور ہم
دونوں اس میں سوار ہو گئے - لوپن نے کوچوان سے کہا -
ہمیں بازار ٹیوربین کے مکان نمبر ۱۴۲ پر پہنچا دو !

مکان نمبر ۴۳ کی نچلی منزل پر وکیل ولیم ڈاٹر کا دفتر تھا وہ خوش طبع انسان تھا۔ کارڈ بھیجنے پر اس نے جھٹ اندر بُلا لیا۔ اس جگہ لوپن کا نام کپتان جینٹ تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو ایک پنشنر فوجی افسر ظاہر کیا۔ لوپن نے نہایت شیریں زبان سے وکیل کو مخاطب کیا:

میں بازار رین یارڈ میں مکان بنانے کے لئے ایک ٹکڑہ خریدنا چاہتا ہوں۔ وہ جگہ بہت مدت سے غیر آباد ہے۔ وہاں ایک شکستہ عمارت ماضی کی یادگار بھی موجود ہے:

جناب وہ عمارت بیچنے کیلئے نہیں۔ وکیل نے نرم لہجہ میں جواب دیا:

لیکن مجھے تو یہی معلوم ہوتا تھا:

مجھے خود افسوس ہے کہ آپ کو کسی نے بالکل غلط اطلاع دی ہے:

یہ کہہ کر وکیل صاحب اُٹھے اور ایک تصویر ہمیں دکھلانے کیلئے اُٹھا لائے ۔۔۔۔۔

جوں ہی میری نظر اس پر پڑی میں حیران ہو گیا۔ بالکل وہی۔ جیسی کہ ایک میرے پاس اور ایک لوئی ڈی ارمانٹ کے کمرے میں لٹک رہی تھی۔ وکیل نے کہا۔ دیکھئے

یہ اسی جگہ کی تصویر ہے جو آپ خریدنا چاہتے ہیں۔

"ہاں! بلاشبہ"

یہ ٹکڑہ زمین اس جرنیل کی جائداد کا ایک حصہ ہے جسے انقلاب فرانس میں قتل کیا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ تمام جائداد اُس کے خاندان کے لوگوں نے بیچ ڈالی۔ مگر یہ ٹکڑا ان لوگوں نے روک رکھا ہے۔۔۔ جب تک۔۔۔ وکیل کھل کھلا کر ہنس پڑا۔

"جب تک کیا؟"

یہ نہایت دلچسپ افسانہ ہے۔ اور وقت گزارنے کے لیے میں اس کی مثل دیکھا کرتا ہوں۔

"مگر کیا میں سُن سکتا ہوں؟"

"ہاں! کیوں نہیں"

انقلاب فرانس کے کچھ دن پہلے ایک شخص لوئس اگری یا ڈی ارنمانٹ نے یہ بہانہ کرکے کہ میں اپنی بیوی سے جو جینوا میں ہے۔ ملنے جاتا ہوں۔ اپنا لیسنٹ جرمن والا مکان بند کر دیا۔ تمام نوکر نکال دیئے گئے۔ وہ اپنے لڑکے اچارلس کو ساتھ لیکر اُس مکان میں جو جگہ پالسی میں ہے۔ چھپ رہا۔ اب اُس کے پاس صرف ایک بوڑھی غلام تھی جو کھانا تیار کرتی تھی۔ جرنیل کو اُس پر کامل الفت تھی۔

کیونکہ وہ اُس کی مدت سے خیر خواہ تھی - اس کو پورا یقین تھا۔
کہ میں یہاں بے خوف زندگی کے دن گذار سکتا ہوں - ایک دن
کھانا کھانے کے بعد پائپ سے دھوئیں کے بادل اُٹھ رہے
تھے - کہ بوڑھی خادمہ ہانپتی کانپتی کمرے میں داخل ہوئی - اور
لرزتی ہوئی زبان سے اپنے مالک سے کہا کہ مسلح سپاہی ادھر آ
رہے ہیں - لوئی ڈی ارنمانٹ ہوشیار ہو گیا - اور جب سپاہی دروازہ
کھٹکھٹا رہے تھے تو وہ باغ کی طرف بھاگا - اور اپنے لڑکے کو
آواز دی کہ صرف پانچ منٹ تک انہیں روکے - مگر اس کی
قسمت نے ساتھ نہ دیا - باغ کی چار دیواری کے باہر سپاہی کھڑے
تھے - اس لئے وہ بھاگ نہ سکا - اور واپس آکر سپاہیوں کے
سوالوں کا جواب نہایت دلیری سے دیتا رہا - اور آخر ان
کے دھمکانے پر اُن کے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا - اس
کے لڑکے چارلس کو بھی قید کر لیا گیا - جس کی عمر ابھی
صرف اٹھارہ سال کی تھی "
" یہ کب کا واقعہ ہے ؟"
" پندرہ اپریل ۱۸۰۷ کا "
یعنی آج کا دن جرنیل کی گرفتاری کی یادگار ہے "
مسٹر ویلم ڈاکٹر نے کیلنڈر اٹھا کر دیکھا اور کچھ حیرت سے بولا -

ہاں اسی دن جرنیل گرفتار ہوا تھا؛

"حیرت انگیز واقع ہے۔ میرے خیال میں تو اس کا انجام بُرا ہوا ہوگا۔

ہاں نہایت خوفناک۔ بہت بُرا۔ کچھ دیر بعد غریب جرنیل قتل کر دیا گیا۔ چارلس جیل میں ہی رہا۔ اور اس کی تمام جائداد ضبط کر لی گئی۔

جائداد بھی تو کافی سے زیادہ ہوگی،

یہ راز آج تک پوشیدہ ہے۔ اس کی اتنی بڑی جائداد کا کسی کو آج بھی پتہ نہ لگا۔ چند ماہ بعد معلوم ہوا کہ جرنل کا لینٹ جرمن والا مکان۔ باغ۔ باغیچے اور جواہرات ایک انگریز نے خرید لئے ہیں۔ کافی سے زیادہ کوشش کی گئی۔ مگر اس دولت کا کچھ پتہ نہ چلا؛

ملحقہ باغ اور مکان؟

جس نے جرنیل کو گرفتار کیا تھا۔ یہ مکان اُسی شخص نے بہت ارزاں خرید لیا۔ اور اسی مکان میں اپنی رہائش کی آخر جب چارلس ڈی ایسفانٹ کو نجات ملی تو وہ اپنے قدیمی مکان کی طرف آیا تو براکیٹ نے اُس پر فائر کیا۔ مگر نشانہ خطا ہوا اور وہ بچ گیا۔ اس کے بعد چارلس نے براکیٹ پر دعوےٰ کر دیا۔ مگر اب بھی قسمت نے اس کا ساتھ نہ دیا۔

اور عدالت نے خلاف فیصلہ کر دیا۔ آخر چارلس نے آخری کوشش
کی۔ اور کچھ رقم دے کر وہ مکان خریدنا چاہتا تھا۔ مگر براکیٹ
نہ مانا۔ اور شائد براکیٹ عمر بھر اس مکان کا مالک رہتا۔ مگر چارلس نے
نپولین بونا پارٹ سے دو زانو ہو کر عرض کی کہ حضور انصاف کریں۔
اُس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر نپولین کے دل میں رحم کا
طوفان اُمنڈ آیا۔ اور دوسرے ہی دن سرکاری حکم سے
براکیٹ نے 12 فروری 1805 کو مکان خالی کر دیا۔ چارلس کو
اتنی مسرت ہوئی کہ مکان تک پہنچنے سے پیشتر ہی انتہائی خوشی کی
وجہ سے پاگل ہو گیا۔

اف! ــــ پھر اس کا کیا انجام ہُوا؟

اس دوران میں اُس کی ماں اور بہن دونوں راہی ملک
عدم ہو چکی تھیں۔ اس لئے بوڑھی خادمہ نے چارلس کی تمام ذمہ داری
اپنے اوپر اٹھائی۔ اور اُس مکان میں رہنے لگی!

1912 میں نزع کی حالت میں ملازمہ نے اپنے دو پڑوسیوں
کو بلایا۔ اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ کہ جرنیل گرفتاری سے
کچھ دیر پہلے اس مکان میں لا انتہا دولت لایا تھا۔ مگر اس
کی گرفتاری کے بعد اس تمام کا کچھ پتہ نہ چلا۔ چارلس
سے صرف یہ معلوم ہُوا۔ کہ مرحوم جنرل نے تمام جائداد کہیں زمین

میں دفن کر دی تھی۔ اپنے بیان کے ثبوت کے لئے ملازمہ نے تین تصویریں دکھائیں۔ یہ تینوں تصویریں جنرل کی قید کے دنوں میں جیل میں بنائی گئی تھیں۔ اور کسی طرح اُن کو خادمہ کے پاس پہنچا دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ایک خط تھا۔ جس میں لکھا تھا۔ کہ یہ تینوں تصاویر میری عورت لڑکی اور لڑکے میں تقسیم کر دی جائیں۔ مگر روپے کے لالچ میں بوڑھی خادمہ اور چارلس نے یہ راز کسی کو نہ بتایا۔ اور یہ تینوں تصاویر اپنے پاس رکھ لیں۔ اس کے بعد چارلس نے مکان کے لئے مقدمہ کیا اور پھر مکان پر قبضہ جمایا۔ اس کے بعد وہ پاگل ہو گیا۔ ملازمہ اُس خزانے کو تلاش کرنے کی بہتیری کوشش کرتی رہی مگر کامیاب نہ ہوئی؛

تو کیا وہ خزانہ ابھی تک کسی کو نہیں ملا؟

نہیں! ابھی تک وہیں موجود ہے۔ اگر بروکیٹ نے جو اُس کی تلاش میں تھا نہ نکال لیا ہو۔ مگر یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ بروکیٹ غربت کی حالت میں فوت ہُوا"

پھر؟

پھر تمام خاندان ہی خزانہ کی تلاش میں مصروف ہو گیا؛

مگر چارلس کا کیا ہُوا؟

وہ ہر وقت کمرے میں ہی رہتا۔ اُس کی زندگی خاموش زندگی

تھی ۔

یعنی؟

چارلس سال میں صرف ایک بار شاید کسی خیال کے زیر اثر باہر نکلتا تھا۔ اور باغ کی اس سڑک پر چلتا۔ جہاں اس کا باپ گرفتاری سے پہلے گیا تھا۔ پھر یا تو اس یونانی ستون کے پاس جاکر بیٹھ جاتا یا کوئیں کے پاس۔ اور پھر پانچ بج کر تائیس منٹ پر وہاں سے اُٹھتا۔ اور کمرے میں واپس چلا جاتا۔ ہر سال ۱۵ اپریل کو وہ باہر نکلتا اور حسب دستور چکر لگا کر واپس کمرے میں چلا جاتا ۱۸۲۵ء میں راہی ملک عدم ہوا۔

کچھ دیر چُپ رہنے کے بعد سوال کیا "اچھا چارلس کی موت کے بعد"...؟

اُس کی موت کے بعد اُس کے رشتہ دار اور اُس کی بھین کے رشتہ دار ہر سال پندرہ اپریل کو وہاں اکٹھے ہوتے ہیں پہلے کچھ سال تو انہوں نے زمین کا کونہ کونہ کھود ڈالا مگر اب یہ کام بند ہے۔ اور اب وہ شاذ و نادر کوئی جگہ کھودتے ہیں زیادہ تر یہ لوگ اس ستون کے پاس آکر بیٹھ جاتے ہیں۔ اور جانے کس طرح کسی آسمانی آواز کے منتظر رہتے ہیں۔ یہ کام مدت سے جاری ہے۔ میں نے اس مکان کی مرمت بھی کرائی ہے۔ مگر یہ لوگ اس کو اسی حالت میں رکھنا چاہتے ہیں۔

"آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میری اپنی رائے تو یہ ہے۔ کہ اس جگہ پر کوئی خزانہ وغیرہ نہیں۔ اور ہمارے پاس اس بات کا ثبوت بھی ہے۔ کہ اس بوڑھی نوکرانی نے اپنے بستر مرگ پر جو کچھ کہا وہ ٹھیک ہے۔ اور ایک پاگل جو ہر سال ایک ہی تاریخ کو ایک خاص جگہ پر آکر گھنٹو بیٹھا رہے۔ اس میں کیا راز ہو سکتا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ جنرل نے اپنا خزانہ اکٹھا کیا تھا۔ پھر اس طرح ڈھونڈنے سے ضرور مل جانا چاہیے تھا۔ کاغذ یا اور ایسی ہی چیز تو آدمی چھپا کر رکھ سکتا ہے۔"

"یعنی کہ یہ تصویر فضول ہے؟"

بے شک بے معنی ہیں۔ ان میں سے کیا خاک پتہ ملتا ہے لوپن جھک کر وہ تصویر جو وکیل نے نکالا تھا۔ غور سے دیکھتا رہا۔ پھر بولا آپ نے تین تصویروں کا ذکر کیا تھا؟"

ہاں ایک یہ موجود ہے۔ جو چارلس کے رشتہ داروں نے ہمیں دیا ہے۔ دوسری لوئی ڈی ارنمانٹ کے پاس ہے۔ اور تیسری کا کچھ پتہ نہیں کیا ہوا۔"

لوپن میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ اور کیا ان سب پر ایک ہی تاریخ لکھی ہے؟

ہاں سب پر ایک ہی تاریخ ہے ۔

کبھی کسی اور شخص نے بھی اس راز کا پتہ لگانے کی کوشش کی ؟

مسٹر ویم ڈاڈ بولا - الینور ! لوگوں نے تو ہمیں تنگ کر رکھا تھا - ہزاروں نے قسمت آزمائی - آخر ہم نے تنگ آ کر یہ فیصلہ کیا کہ رشتہ داروں کے سوا جو آدمی گڑھے ہوئے خزانہ کی تلاش کرنا چاہیئے - وہ فیس دے ۔

کتنی فیس ؟

ایک ہزار فرانک ۔

کیا لوگ اس شرط کے لگنے سے ڈر گئے ؟

نہیں ابھی تو پچھلے سال ہنگری کا بینا لسنٹ میرج میں آیا تھا - جس نے میرا سال بھر فضول گنوا دیا - آخر ہم نے یہ فیس بڑھا کر پانچ ہزار فرانک کر دی - اور یہ شرط لگا دی - کہ اگر کوئی شخص یہ گڑھا ہوا خزانہ معلوم کر لے تو اُس تیسرا حصہ دیا جائے گا - اور اگر وہ کامیاب نہ ہو تو فیس کا روپیہ اس مکان کے وارثوں میں بانٹ دیا جائیگا - تب کہیں یہ بلا ٹلی ہے ۔

لوپن کہنے لگا لیجئے یہ پانچہزار فرانک موجود ہیں ۔

وکیل چونک کر کہنے لگا یہ کیا؟
لوپن نے جیب سے ایک ایک ہزار کے پانچ نوٹ نکال کر رکھ دیئے۔ اور بولا کہ یہ پانچ ہزار فرانک لیجئے۔ ایک رسید لکھ دیجئے اور جنرل کے سارے وارثوں کو اطلاع دے دیں کہ اگلے سال پندرہ اپریل کو مجھے اس جگہ پر ملیں۔
وکیل اور میں خود بھی حیرت سے لوپن کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر مسٹر ویم ڈاٹر نے کہا۔
"سچ مچ؟"
"ضرور"۔
مگر یاد رہے کہ اس خزانے کا کوئی صاف ثبوت نہیں ہے میں آپ سے اختلاف رائے ظاہر کرتا ہوں!
وکیل نے بڑے غور سے لوپن کی طرف دیکھا۔ شائد وہ اسے پاگل سمجھنے لگا تھا۔ پھر کاغذ نکال کر رسید لکھ دی۔ کہ اگر کامیاب ہو گیا تو تیسرہ حصہ اسے دیا جائے گا۔ زبانی اس نے کہا اگر آپ کی مرضی نہ ہو تو مجھے کم از کم ایک ہفتہ پہلے اطلاع دے دیں۔ جس سے میں ان لوگوں کو خواہ مخواہ تکلیف نہ دوں۔ مگر لوپن نے لاپرواہی سے کہا۔
مسٹر ویم ڈاٹر آپ ان لوگوں کو آج ہی اطلاع دے دیں۔

جس سے وہ سارا سال خوشی سے گذار سکیں۔"

ہم نے وکیل سے ہاتھ ملایا۔ اور باہر بازار میں آسئے۔

میں نے پوچھا لوپن کچھ پتہ مل گیا ہے؟"

" کہنے لگا "نہیں۔ ابھی تک تو خاک پتہ نہیں چلا۔"

اور تم یہ بھی سن چکے ہو کہ لوگ ہزاروں بار ڈھونڈ چکے ہیں۔

ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں۔ ضرورت تو صرف غور سے سوچنے کی ہے اب مجھے غور کرنے کے لیئے سال بھر 365 دن مل گئے ہیں۔ جو ضرورت سے بہت زیادہ ہیں۔ ڈر ہے کہ میں اس معاملہ کو بھول ہی نہ جاؤں۔ اس لئے تم مجھے کبھی کبھی یاد دلاتے رہا کرنا۔"

۲

وقت گذرتا گیا۔ اس کے دوران میں میں نے لوپن کو کئی بار یاد دلایا کہ پندرہ اپریل کا دن نزدیک آرہا ہے۔ مگر اس نے کبھی اس پر بہت غور نہ کیا۔ اس کے بعد وہ کئی مہینے تک کہیں غائب رہا۔ اور اس سے میرا ملاپ نہ ہو سکا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ اٹلی گیا ہوا تھا۔ اور اس کے ہی خطوط سے سلطان عبدالحمید کو تنزل ہوا۔"

میں کبھی کبھی اس کو خط لکھا کرتا اور یاد دلاتا رہتا تھا۔

میں نے اسے لوئی ڈی ارنمانٹ کی ایک شخص سے محبت کا واقع لکھا
مجھے معلوم ہُوا کہ لوئی جو ایک بیوہ تھی ایک دولت مند نوجوان
پر عاشق ہو گئی - اور وہ بھی اس سے شادی کرنے کو تیار تھا -
مگر اس کے خاندان کے لوگ اس کے خلاف تھے - آخر اس
نے لوئی کو جواب دے دیا - بیچاری لوئی کی حالت اس وقت
قابل رحم تھی -

مگر لوپن نے میرے کسی بھی خط کا جواب نہ دیا - مجھے شک
ہُوا کہ میرے خطوط اسے ملتے بھی ہیں کہ نہیں - ادہر پندرہ
اپریل کا دن آ رہا تھا - اور میں حیران تھا - کہ دیکھوں لوپن
وقت پر پہنچ سکتا ہے کہ نہیں - قصہ کوتاہ یہ کہ پندرہ اپریل کا
دن آ گیا - اور میرے ناشتہ کے وقت تک لوپن کا پتہ نہ تھا -
تنگ آ کر میں خود ایک گاڑی میں سوار ہُوا - اور پاس والے
مکان کی طرف چلا - مکان کے باہر مزدور آدمی کے چار دن بجے
کھڑے ہوئے تھے - انہوں نے میرے آنے کی خبر مسٹر ولیم ڈاٹر کو
دی - وکیل مجھ سے بڑی اچھی طرح ملا - اور کہا کیپٹن کپتان
جینٹ کہاں ہیں -

میں نے حیران ہو کر کہا - کیا ابھی تک نہیں آئے ؟
"وہ بولا نہیں - اور یہاں تو ہر ایک شخص گبھرا رہا ہے"

یہ سب لوگ وکیل کے گھر کھڑے ہو گئے تھے۔ آج ان کے چہروں پر وہ اداسی نہ تھی۔ جو ہم نے اسی دن پچھلے سال دیکھی تھی۔ اتنے میں مسٹر ولیم ڈائر بولا۔ ان لوگوں کو اس وقت پوری امید ہے کہ ان کو خزانہ مل جائے گا۔ مگر میرا اس میں کیا قصور ہے۔ آپ کے دوست نے مجھے یقین دلایا تھا۔ کہ میں ضرور اس خزانے کو نکالوں گا۔"

وکیل نے کپتان جینٹ کے متعلق جو لوپن کا فرضی نام تھا۔ مجھ سے کئی باتیں پوچھیں۔ اور میں اس کا ایسا دلچسپ جواب دیتا تھا کہ جنرل کے وارث بڑے شوق سے سنتے تھے۔ آخر وہ بھدا موٹا سا آدمی بولا۔ اس کا تو ہمیں یقین تھا کہ یہ خزانہ آج مل جائیگا۔ سب لوگ اسی طرح کی باتیں کر رہے تھے لوئی ڈی ارنمانٹ بولی۔ اور اگر یہ کپتان صاحب آئے ہی نہ تو؟ ایک شخص کہنے لگا۔ کوئی ڈر نہیں۔ پانچ ہزار فرانک تو ہمارے ہاں ہیں۔"

مگر سب لوئی ڈی ارنمانٹ کے یہ الفاظ سن کر کچھ غمگین سے ہو گئے۔ ڈیڑھ بج گیا۔ سب لوگ کپتان جینٹ کی انتظار کرتے کرتے تھک گئے۔ اور ایک کے بعد دوسرا زمین پر بیٹھنے لگے۔ موٹا بھدا آدمی غصے سے بولا۔ سارا قصور مسٹر ولیم ڈائر کا

ہے۔ ان کا فرض تھا کہ اس بھلے مانس کو ساتھ لاتے۔ سب میری طرف گھور کر دیکھنے لگے۔ میں دل میں لوپن کو نہ آنے پر کوس رہا تھا۔ آخر میں نے وکیل کو دبی آواز میں کہا۔ میرے خیال میں وہ نہ آئیں گے!

میں واپس جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ سب سے بڑا لڑکا بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا۔ کوئی آدمی موٹر سائیکل پر آرہا ہے۔ بے شک دیوار کی دوسری طرف کوئی بڑی تیزی سے موٹر پر آرہا تھا۔ اس نے پاس آکر سائیکل کو روکا۔ اور جلدی سے اترا۔ کپڑے ایسے تھے۔ جیسے پہن کر کوئی آدمی موٹر سائیکل کی سواری نہیں کرتا۔ وکیل نے اجنبی کو دیکھ کر کہا۔ یہ تو کپتان جینٹ نہیں ہیں۔

لوپن نے ہم سے ہاتھ ملایا۔ اور کہنے لگا۔ کیوں نہیں میں ہی تو کپتان جینٹ ہوں۔ اس میں نے اپنی مونچھیں مونڈ ڈالی ہیں۔ مسٹر ویم ڈایر دیکھئے دیا آپ کی رسید موجود ہے!

پھر ایک بچے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر وہ کہنے لگا۔ بازار سے ایک کرائے کی موٹر جلد لاؤ۔ میں نے دو بجے یا زیادہ سے زیادہ سوا دو بجے یہاں سے چلے جانا ہے!

یہ سن کر سب لوگ شور مچانے لگے مگر کپتان جینٹ نے

گھڑی نکال کر کہا - ابھی دو بجنے میں بارہ منٹ ہیں - ابھی کافی وقت ہے مگر خدا جانتا ہے کہ میں بہت بھوکا اور تھکا ہُوا ہوں ؟

سپاہی نے ڈبل روٹی کا ایک ٹکڑا اُسے دیا - جسے وہ ایک طرف بیٹھ کر کھانے لگا - اور بولا امید ہے آپ لوگ مجھے معاف کریں گے - مارہیلز سے جو ڈاک گاڑی آتی ہے - مَیں اس میں سوار تھا - راستے میں گاڑی پٹڑی سے اُتر گئی - واقع نے دس بارہ آدمی مر گئے اور بہت سے زخمی ہوئے - مَیں ان لوگوں کی مرہم پٹی میں لگا رہا - یہ موٹر سائیکل مجھے وہیں مل گیا - مسٹر ویم ڈائیر مہربانی کر کے اُسے اس کے مالک کے پاس پہنچا دیں - اس کے نام کا لیبل اس پر لگا ہُوا ہے - "واہ! تم آگئے - گاڑی نے آئے ہ!"

لڑکے نے کہا جی ہاں بازار کے کونے پر کھڑی ہے ؟

لوپن اُٹھا - اور گھڑی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا اب ہمیں وقت ضائع نہ کرنا چاہیئے ؟

سب لوگ بڑے شوق سے کپتان صاحب کی طرف دیکھ رہے تھے - میں خود حیران تھا - مگر مجھے چونکہ لوپن کے کمال کا علم تھا - اس لئے میَں چپ رہا - وہ اپنی جگہ سے

اُٹھا اور دھوپ گھڑی کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔
یہ گھڑی ایک آدمی کی شکل کے ستون پر کھڑی تھی۔ ستون کے ساتھ ایک سنگ مرمر کا تختہ لگا ہُوا تھا۔ اور اس پر کچھ لفظوں کی نقش و نگاری کی گئی تھی۔ مگر الفاظ اس قدر دھندلے تھے۔ کہ پتہ نہ لگتا تھا۔ کہ اس پر کیا لکھا تھا۔ اس پتھر کی تختی پر محبت کے دیوتا کی تصویر تھی۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک تیر تھا۔ کپتان بڑے غور سے جھک کر گھڑی کو دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ کوئی شخص چاقو دینے کی مہربانی کرے۔
پاس ہی کسی جگہ کے گھڑیال نے دو بجائے اور ٹھیک اسی وقت دیوتا کے تیر کا سایہ گھڑی کے ڈائیل پر ایسی جگہ آیا جہاں سے وہ سنگ مرمر کی تختی ٹھیک دو حصّوں میں کھل جایا کرتی تھی۔ کپتان نے چاقو لے کر بڑی پھرتی سے اس پتھر کی تختی پر سے جہاں تیر کا سایہ پڑ رہا تھا۔ مٹی کھودنی شروع کی۔ چار پانچ انچ کھودنے پر چاقو کسی چیز پر رکا۔ کپتان نے انگوٹھا اور ایک انگلی اس جگہ میں داخل کی اور مٹی میں ڈھکی ہوئی ایک چیز نکال لی اور وکیل کو دے دی۔ اور کہنے لگا یہ لیجیے یہ ابھی آغاز ہی ہُوا ہے۔

یہ ایک بہت بڑا چمکدار ہیرا تھا۔

پھر بڑے غور سے چاقو سے مٹی کھودنے لگا۔ پھر اس کا چاقو کسی چیز سے رُکا۔ اور پھر اس نے انگلی ڈال کر ایک بڑا ہیرا نکالا۔ اسی طرح تیسرا اور پھر چوتھا یہاں تک کہ اس نے ایک کے بعد ایک اٹھارہ بیش قیمت ہیرے نکال دیئے۔

سب لوگ مورتی کی طرح چپ چاپ کھڑے تھے۔ اور آنکھیں پھاڑ کر تصویر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر موٹا شخص بولا واہ ری قسمت۔

وکیل کہنے لگا۔ شاباش کپتان صاحب شاباش۔ سب لوگ مارے خوشی کے پاگل ہوگئے تھے۔ آخر وہ کچھ ٹھنڈے ہوئے۔ تو کپتان جینٹ کا شکریہ ادا کیا۔ مگر یہ دیکھ کر وہ بہت حیران ہوئے کہ وہ وہاں موجود نہ تھا۔ ان کے بغیر دیکھے ہی نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔

(۲۳)

اس کے کئی سال بعد مجھے لوبن سے ملنے کا موقعہ ملا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ تم نے وہ راز کیسے حل کیا؟

وہ بڑی لاپرواہی سے کہنے لگا - ان اٹھارہ ہیروں کے معاملے کا ذکر کرتے ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے حیرانگی ہے کہ اس دبے ہوئے خزانے کو بہت بار سینکڑوں نے ڈھونڈا مگر کامیاب نہ ہوئے ۔ حالانکہ وہ اٹھارہ بیش قیمت ہیرے ذرہ سی مٹی میں دبے تھے ۔

میں نے کہا مگر تم نے یہ اندازہ کیسے لگایا کہ اس سنگ مرمر کی تختی میں ہی یہ ہیرے رکھے ہوئے ہیں؟ اندازہ کیا! میں اس پر بہت دیر سوچتا رہا - مجھے پہلے ہی یہ خیال پیدا ہو گیا تھا - کہ اس راز کو فاش کرنے کا بھید اس مدن کے تر میں چھپا ہے ۔

چارلس نے پاگل ہونے سے پہلے ان تصویروں پر جو ایک ہی تاریخ لکھ دی تھی - وہی اس راز کو فاش کرنے والی تھی - مگر بعد میں جب وہ پاگل ہو گیا - تو صرف ایک عادت سے وہ ہر سال پندرہ اپریل کو باغ میں آ جاتا تھا ۔ اور دھوپ گھڑی یا کنوئیں کے پاس بیٹھتا تھا - اور پھر ہمیشہ ٹھیک اسی وقت یعنی پانچ بج کر پچیس منٹ پر واپس چلا جاتا تھا ۔ ممکن ہے - کہ اس کے دماغ میں یہ بات کسی طرح آئی ہو - مگر وہ عقل

ٹھکانے نہ ہونے کی وجہ سے اس راز کے کھونے
میں ناکامیاب رہا ہو۔ مگر ہر حالت میں اس کا
ایسا کرنے کی وجہ مرے ہوئے جنرل کی تین تصویریں
اور دھوپ گھڑی ہی تھی۔ زمین کا سورج کے
گرد چکر لگانا ہی چارلس کو گھڑی کے پاس آنے
کو اکساتا تھا۔ اور کیوں کہ یہ سال بھر میں صرف
ایک بار ہوتا ہے۔ اس لئے یہ پاگل سال میں ایک ہی
بار ایک ہی وقت ایک ہی تاریخ پر اس کو ڈھونڈھنے
نکلتا تھا۔ اور پانچ بجے کیوں کہ اس باغ میں چھایہ پڑنی
شروع ہو جاتی تھی۔ اور دھوپ گھڑی سے
سورج گذر چکتا تھا۔ اس لئے وہ اس وقت کمرے
میں واپس جاتا تھا۔ ان سب باتوں سے میں اس فیصلہ
پر پہنچا کہ دھوپ گھڑی میں ہی معاملے کا راز چھپا ہے!
مگر تم کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ ٹھیک دو بجے دھوپ
گھڑی کے اوپر مدن کے تیر کا سایہ جس جگہ ہو گا۔
وہیں اس کا بھید کھل جائے گا؟

وہ کہنے لگا یہ بڑی آسان بات تھی۔ تصویروں
سے یہ پتہ چلتا تھا۔ تصویروں پر تاریخ کے طور پر

جو دو کا ہندسہ لکھا تھا۔ اس سے میں اس فیصلہ پر پہنچا۔ کہ اس ہندسے کا اس راز کو فاش کرنے میں ضرور حصّہ ہے؟

یعنی تمہارے خیال میں یہ دو کا ہندسہ دھوپ گھڑی کے چھ بجے کا اشارہ تھا۔

بے شک جنرل نے اپنی ساری جائداد جمع کر کے اس سے یہ اٹھارہ ہیرے مول لئے۔ جب سپاہی اس کو پکڑنے آئے تو وہ باغ کی طرف بھاگا۔ خوش قسمتی سے اس کی نظر دھوپ گھڑی پر پڑی اس وقت دو بجے تھے۔ اور سنگ مرمر کی تختی میں جو برابر ٹوٹا ہوا تھا۔ اس وقت سوئی کا سایہ اس پر پڑ رہا تھا۔ اس لئے جنرل نے یہ ہیرے مٹی میں ملا کر اس چھید میں ڈال دیئے؟

مگر مدن کے تیر کا چھاپہ تو ضرور اس تختی پر اس جگہ پڑتا ہے۔ یہ بات تو صرف پندرہ اپریل کی خاص نہیں؟

ٹھیک ہے۔ مگر ہمیں ایک پاگل آدمی کی باتوں کا بھی خیال کرنا چاہیے تھا۔ یہ آدمی کیونکہ پندرہ

اپریل کو کمرے سے نکلتا تھا۔ اس لئے اس کے وارث
اسی دن گڑھے ہوئے خزانہ کا پتہ لگانے کی کوشش کرتے تھے!
یعنی تم جب چاہتے باغ میں جاکر سارے ہیرے
نکال سکتے تھے۔ اس میں شک ہی کیا ہے۔ مگر ان لوگوں کے
خیالات کا بہت خیال تھا۔ اور سچ پوچھو تو میرا
دل فیاضی کی طرف جھکا ہوا تھا۔ گو مجھے افسوس ہے
کہ میں نے کیوں ایسی غلطی کی۔
غلطی!۔۔۔۔۔۔غلطی کا کیا مطلب آخر ان اٹھارہ
ہیروں میں سے چھ تمہارے تھے!
لوپن زور سے ہنس کر کہنے لگا۔ خوب! تم نے سنا نہیں؟
دوسرے ہی دن یہ لوگ کپتان جینٹ کے خلاف ہو گئے۔
اور سب سے پہلے جن لوگوں نے خلافی کی وہ دونوں
ہم عمر عورتیں اور موٹا آدمی تھا۔ رہی وہ رسید
وہ بھی ایک فضول چیز تھی۔ کپتان جینٹ کس طرح یہ
گواہی دلا سکتا تھا۔ کہ میں فوج کا پنشن لینے والا
کپتان ہوں۔ وہ سب صاف کہتے تھے۔ کہ اگر یہ آدمی
اپنا حصہ لینا چاہے۔ تو عدالت میں مقدمہ کرے۔
اور لوئی ڈی ار نمانٹ؟

صرف وہی ایک ایسی عورت تھی - جو ان لوگوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی - مگر اسے بھی کیا ضرورت تھی - کہ راہ جاتے سر درد مول لیتی - اب وہ ایک امیر عورت تھی - اور اس کی شادی ہو چکی تھی ۔۔۔۔

"پھر؟"

پھر کیا میں بے بس تھا آخر ان سب میں سے چھوٹا پیرا مجھے منظور کرنا پڑا - اس دنیا میں کسی پر رحم کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے "

یہ کہہ کر لوبن چھپ گیا - پھر ذرا رُک کر بولا نیکی ۔۔۔ یہ بالکل جھوٹ اور بے فائدہ کو کسی کا احسان مند نہیں - ہر ایک آدمی کو سچا حوصلہ دینے والا اس کا اپنا آتما ہے - وہی اسے اپنا فرض ادا کرنے پر شاباش دیتا ہے - اور بس "

مجھے تو اس نے تنگ کر رکھا ہے۔ حیا نہ معلوم کیوں میرے پیچھے لگی رہتی ہے۔ ہر وقت ہر گھڑی۔ جدھر جاتی ہوں میرے پیچھے۔ جہاں جاتی ہوں میرے ساتھ۔ جو کچھ بھی کرتی ہوں اُس میں شامل۔ اگر لب وا کرنا چاہتی ہوں تو مہر لگا دیتی ہے۔ اگر اُن کے پاس جاتی ہوں تو ہر عضو لکارہ آنکھیں بند۔ زبان خاموش —— ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اسے مجھ سے کسی گذرے ہوئے جنم کا بیر ہے۔ نامعلوم اس میں کونسی کشش۔ کیسی پُر اثر طاقت پوشیدہ ہے۔ کہ لاکھ کوشش کرنے پر بھی میں اسے اپنے سے جدا نہیں کر سکتی۔ کمال ہے یہ حیا۔ خوب چمٹی۔

اسی کی وجہ سے کل ہردلیشور ناراض ہو گئے —— وجہ؟ صرف یہ تھی کہ میں نے ایک ہار گوندھ کر ملازمہ کے ہاتھ بھیج دیا تھا۔ ساس اور نند کی شرم سے میں خود نہ جا سکی۔ یہی بات تھی جو انہیں ناگوار گذری اور ملازمہ سے کہہ دیا۔

"میں اس سلئے بہت بہتر اور اچھا ہار بازار سے خرید سکتا ہوں - اسے واپس لے جاؤ —— مجھے ضرورت نہیں!"

ہار کے واپس آتے ہی میں سمجھ گئی کہ وہ خفا ہو گئے ہیں - اور اسی لئے انہوں نے میری اس قدر بے عزتی کی ہے. وہ اسے بھی قابل قبول تصور کرتے - جب میں خود حاضر ہوتی اور اپنے ہاتھ سے ہار پہناتی -

(۲)

آج میں نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا ہے - میں خود جاؤنگی اور اپنے ان حنائی ہاتھوں سے اپنے دیوتا کو ہار پہناؤنگی - وہ روٹھ گئے ہیں - انہیں مناؤں گی -

میں باغیچہ میں گئی اور کافی گھنی چھاؤں میں بیٹھ کر ہار تیار کرنے لگی - وہ نصف سے کچھ زیادہ تیار ہو گیا تھا - کہ آواز میرے کانوں میں پہنچی -

"بہو! —— سہاگ ونتی!!"

ابھی سب مجھے انہیں دو ناموں سے پکارتے تھے. کیونکہ ابھی چند ہی دن ہوئے میں میکے سے آئی ہوں —— میں چونکی جلدی اور الجھن میں ادھر سے

ہی ہار میں گرہ دے دی۔ اتنے میں میری چھوٹی نند میرے قریب آئی اور شیریں لہجہ میں کہنے لگی۔

"آپ یہاں چھپی ہیں ماں کافی دیر سے تمہیں بلا رہی ہیں"

میری ساس کام میں مصروف ہو گئیں۔ نند کھیں خوشی میں لگ گئی۔

میں نے سوچا اس وقت جا کر ہار پہناؤں۔ وہ اوپر ہیں اور بالکل اکیلے ہیں۔ اس وقت ہار بھی پہنا دوں گی اور سابقہ قصور کی معافی بھی مانگ لونگی۔ دبے پاؤں کمرہ سے باہر نکلی برآمدے میں پہنچی۔ ہر جانب نگاہ ڈالی کہ کوئی مجھے دیکھتا تو نہیں۔ بھگوان کی اپار کرپا ہوئی۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ بالکل سناٹا۔ لپک کر جھٹ سیڑھی پر چڑھ گئی۔ ابھی دو ہی سیڑھیاں چڑھی کہ یہی شیطان حیا نا معلوم کدھر سے آ موجود ہوئی۔ اور طلائی زنجیر بن کر پاؤں میں پڑ گئی۔ پاؤں من من کا وزنی ہو گیا۔ دماغ میں سینکڑوں خیالات نے گھر کر لیا۔

کیسے جاؤں؟۔ کوئی دیکھ نہ لے۔ وہ مجھے اس وقت دیکھ کر کیا خیال کریں گے؟۔

ان سب خیالات کے زیر اثر میں ایک سیڑھی نیچے اتر آئی دوبارہ پھر خیالات نے پلٹا کھایا۔

"کیا کہیں گے؟ کچھ بھی نہیں — اتنی حیا بھی اچھی نہیں!"

بڑی ہمت کر کے حیا کی زنجیر پاؤں سے اتاری اور اوپر چڑھ گئی۔ مگر پھر ٹھہری۔ پاؤں آگے جانے سے دوبارہ انکار کر رہے تھے۔ پھر الجھن پیدا ہوئی۔

"کیسے جاؤں؟ انہیں کیا کہوں گی؟ اگر وہ خود ہی دروازے کی طرف منہ کئے بیٹھے ہوں گے تو ان کے پاس ہی کیسے پہنچوں گی؟"

دس

عجب حال ہے مسئلہ حل ہی نہیں ہوتا۔ اوپر جاؤں یا نیچے کمال تذبذب میں پڑی ہوں۔ کبھی جرأت۔ طاقت، اور حوصلہ یکجا ہو جاتے ہیں تو لگا اوپر اٹھ جاتی ہے اور کبھی تمام جواب دے دیتے ہیں۔ تو نظر نیچے کو جھک کر رہ جاتی ہے۔ میں ابھی اس کشمکش و پیچ میں تھی کہ دروازہ کھلا اور پاؤں کی آہٹ سن کر میرا کلیجہ دھڑکنے لگا — اوپر سے وہی خود آ رہے تھے۔

"اب کیا کروں؟ کدھر جاؤں؟ چشم زدن میں بھاگ

بھی تو نہیں سکتی۔"

وہ زینے پر آ گئے۔ میں گھبرا اٹھی۔ اور کر تی بھی کیا۔ وہیں گٹھڑی سی بن کر زینے پر بیٹھ گئی۔ وہ میرے پاس آ کر رُک گئے۔

میں نے محسوس کیا اگر ہو سکے تو اس دیوار میں سما جاؤں یا کسی جادو کے زیر اثر انثوب ہو جاؤں مگر کر کچھ بھی نہ سکی۔ تمام جسم پسینہ سے شرابور ہو گیا انہوں نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا۔ تما جسم لرز اٹھا۔

یہاں کیا کر رہی ہو؟۔ کیا وہاں کمرے میں آنے کی قسم اٹھا رکھی ہے؟

میں تمہاری راہ مدت سے دیکھ رہا ہوں۔ مگر تم ہو کہ بالکل پرواہ ہی نہیں۔؟"

میں ان کے ان تمام سوالات پر بھی پتھر کے بُت کی طرح خاموش بیٹھی تھی۔ زبان تک حرکت میں نہ آئی۔

لب واہ نہ ہوئے۔ ہاں سانس کی تیزی ضرور بڑھ گئی۔ میں خیال کیا کہ یہ بھی بند ہو جائے تو بہتر ہے۔

وہ بار بار سوال کرتے تھے۔ مگر میں لاکھ کوشش کے باوجود بھی جواب نہ دے سکتی تھی۔ زبان جیسے اکڑ چکی تھی۔ اور ہلنے کا نام تک نہ لیتی تھی۔ وہ میری اس سرد مہری پر ناراض ہو کر واپس جانا چاہتے تھے۔ میری آنکھیں پُرنم ہو گئیں۔ اپنی اس حالت پر دلیری کو رحم آ گیا۔ اُن کے مُنہ پھیرتے ہی میں نے ادھورا ہار آنچل سے نکالا اور چاہا کہ اُن کے گلے میں ڈال دوں۔ مگر وہ بالکل چھوٹا تھا۔ میں یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح گلے میں پڑ جائے۔ مگر وہ ٹوٹ گیا اور تمام کلیاں منتشر ہو گئیں۔ اور آٹھ دس کلیاں برآمدے میں بھی جا پڑیں۔

انہوں نے محبت سے میری طرف دیکھا۔ اور زیر لب مسکرا کر چلے گئے۔

"مگر اب میں نیچے کیسے جاؤں؟"

ساس نند برآمدے میں تھیں۔ چھوٹی جٹھانی کھل کھلا کر ہنس پڑی اور اُن سے کچھ کہا۔ اور میں سیڑھیوں میں حیا کی وجہ سے گھڑی جا رہی ہوں۔

نیچے اُترنے کا راستہ تک نظر نہیں آتا۔"

"ساوتری دیوی"

خود غرض میونسپل کمشنر

کا دوسرا حصہ

میونسپل کمیٹی کی کارگذاریاں

قابل مصنف نے دل ہلا دینے والے واقعات کا کیمرہ
قلم سے اس خوبی کے ساتھ فوٹو کھینچا ہے کہ داد دیئے
بغیر نہیں رہا جاتا۔ قومی خادم مسٹر ناتھ نے جن انوکھے
نرالے ڈھنگوں سے محکمہ تعلیم، عمارت، حفظان صحت،
واٹر ورکس، بجلی گھر وغیرہ وغیرہ کی اصلاح کی ہے پڑھنے
سے تعلق رکھتے ہیں +

بھارت پبلشنگ بھنڈار کٹڑہ آہلو والیہ (گھنٹہ گھر) امرتسر

Only title page printed at 'Durga Dass Press' Amritsar.

بھارت پستک بھنڈار کٹڑہ آہلو والیہ (گھنٹہ گھر) امرتسر